المنار جرمنی

Almanar Deutschland

جنوری تا مارچ 2022

المنار جرمنی

جنوری۔فروری۔مارچ 2022 بمطابق: صلح۔تبلیغ۔امان۔1401 ہجری

زیرِ نگرانی

پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب
سرپرست تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

چوہدری عبدالغفور ڈوگر

مدیر اعلیٰ المنار

چوہدری محمد کولمبس خاں

پتہ
Bait us Sabooh
Genferstrasse 11
60437 Frankfurt / M
E-Mail:
columbuskhan@gmail.com

اس رسالہ کی تیاری میں مکرم نوید حمید صاحب از فرینکفرٹ نے تعاون فرمایا۔ گرائمر اور املاء کی درستی بھی کی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

ارشادِ باری تعالیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿1﴾

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ ﴿2﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ ﴿3﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ ﴿4﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ ﴿5﴾ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ ﴿6﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ ﴿7﴾ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ ﴿8﴾ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ ﴿9﴾ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ ﴿10﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۪ ﴿11﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۪ ﴿12﴾ وَاِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۪ ﴿13﴾ وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ۪ ﴿14﴾

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ؕ ﴿15﴾

اللہ کے نام کے ساتھ جو بے انتہار حم کرنے والا، بِن مانگے دینے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ اور جب دس ماہ کی گابھن اُونٹنیاں بغیر کسی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی۔ اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور جب سمندر پھاڑے جائیں گے۔ اور جب نُفوس ملا دیئے جائیں گے۔ اور جب زندہ در گور کی جانے والی (اپنے بارہ میں) پوچھی جائے گی۔ (کہ) آخر کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی ہے؟۔ اور جب صحیفے نشر کئے جائیں گے۔ اور جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔ اور جب جہنّم بھڑکائی جائے گی۔ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی۔ ہر جان معلوم کر لے گی جو وہ لائی ہو گی۔

حدیثِ نبوی ﷺ

بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ : شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ.

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔"

(بخاری، الصحیح، کتاب الایمان، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : بنی الإسلام علی خمس، 1 : 12، رقم : 8)

ملفوظات حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام

"اے تمام وہ لوگو جو زمین پر رہتے ہو اور اے تمام وہ انسانی روحو! جو مشرق اور مغرب میں آباد ہو! میں پورے زور کے ساتھ آپ کو اس طرف دعوت کرتا ہوں کہ اب زمین پر سچا مذہب صرف اسلام ہے اور سچا خدا بھی وہی خدا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور ہمیشہ کی روحانی زندگی والا نبی اور جلال اور تقدس کے تخت پر بیٹھنے والا حضرت محمد مصطفٰے ﷺ ہے۔"

(تریاق القلوب صفحہ 7)

ارشادت حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ

(بر موقعہ افتتاح تعلیم الاسلام کالج قادیان۔2جون1944)

"یہ تقریب جو آج تعلیم الاسلام کالج کے افتتاح کی ہے اپنے اندر دوگنا مقاصد رکھتی ہے۔ ایک مقصد تو اشاعت تعلیم ہے جس کے بغیر تمدنی اور اقتصادی حالت کسی جماعت کی درست نہیں رہ سکتی۔

جہاں تک تعلیمی سوال ہے یہ کالج اپنے دروازے ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے کھلے رکھتا ہے کیونکہ تعلیم کا حصول کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیم کو بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہر انسان کے لئے ممکن اور سہل الحصول بنادیں۔ میں نے لاہور میں ایک دو ایسی انسٹی ٹیوٹ دیکھیں جن کے بانی نے یہ شرط لگادی تھی کہ ان میں کسی مسلمان کا داخلہ ناجائز ہو گا۔ مجھ سے جب اس بات کا ذکر ہوا تو میں کہا اس کا یک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ایسی ہی انسٹی ٹیوٹ قائم کریں اور اس میں یہ واضح کریں کہ اس میں کسی غیر مسلم کا داخلہ ناجائز نہ ہو گا، کیونکہ ایک مسلم کا اخلاقی نقطہ نگاہ دوسری قوموں سے مختلف ہوتا ہے۔ پس جہاں تک تعلیم کا سوال ہے ہماری پوری کوشش ہو گی کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا آسان ہو۔ اس کالج کے دروازے ہر مذہب وملت کے لوگوں کے لئے کھلے ہوں اور انہیں ہر ممکن امداد اس انسٹی ٹیوٹ سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی جائے۔

دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ آج کل کی تعلیم بہت سا اثر مذہب پر بھی ڈالتی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ غلط اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ مذہب کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کا فعل اس کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ نہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ خدا کا قول اُس کے فعل کے خلاف ہوتا ہے۔ ہمیں ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہے کہ خواہ ہمارے پاس ذرائع نہ بھی ہوں جن سے ان اعتراضات کا اسی رنگ میں دفعیہ کیا جا سکتا ہو جس رنگ میں وہ اسلام ہت کئے جاتے ہیں یا جن علوم کے ذریعہ اور اعتراضات کئے جاتے ہیں اُنہی علوم کے ذریعہ اُن اعتراضات کو رد کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ یقینی بات ہے کہ جو اعتراضات خدا تعالیٰ کی ہستی پر پڑتے ہیں یا جو اعتراضات خدا تعالیٰ کے رسولوں پر پڑتے ہیں یا جو اعتراضات اسلام کے بیان کردہ عقائد پر پڑتے ہیں وہ تمام اعتراضات غلط ہیں اور یقیناً کسی غلط استنباط کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ اس قسم کے اعتراضات کا مرکز کالج ہوتے ہیں اس لئے ہمارے کالج کے قیام کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ مذہب پر جو اعتراضات مختلف علوم کے پڑھانے والے پروفیسر مقرر ہوں وہاں ان کا ایک یہ کام بھی ہو کہ وہ انہی علوم کے ذریعہ ان اعتراضات کو رد کریں اور دنیا پر ثابت کریں کہ اسلام پر جو اعتراضات ان علوم کے نتیجہ میں کئے جاتے ہیں وہ سر تا پا غلط اور بے بنیاد ہیں"

(انوار العلوم صفحہ 299،300)

اِک وقت آئے گا کہ کہیں گے تمام لوگ
ملت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

اپریل 1950 سے تعلیم الاسلام کالج مجلّہ "المنار" کے اجراء کے موقع پر مجلّہ "المنار" کے نام

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمدؒ خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا پیغام

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ

"زندگی مسلسل جستجو کا نام ہے۔ کلاس روم میں آپ پہلوں کی جستجو کے نتائج سنتے ہیں۔ انہیں سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نتائج پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا آپ کو موقعہ میّسر نہیں آتا۔ کلاس روم تخلیق کا میدان بھی نہیں مگر تنقید و تحقیق کے بغیر آپ کی زندگی بے معنی ہے۔ "پدرم سلطان بود" آپ کو زیب نہیں دیتا۔ دنیا کو جس حالت پر آپ نے پایا اس سے بہتر حالت پر آپ نے اسے چھوڑنا ہے۔ کالج میگزین تنقید و تحقیق کا ایک وسیع میدان آپ کے سامنے کھولتا ہے۔ اب آپ کا فرض ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ دیدہ بینا سے دنیا کو دیکھیں۔ عقلِ سلیم سے اسے پرکھیں۔ ذہن رسا سے اس کی غیر معروف وادیوں میں داخل ہوں۔ اس کی چھپی ہوئی کانوں میں جائیں اور آنے والی نسلوں کے لئے دُرِ بے بہا تلاش کریں۔ اسلام کو آج روشن دماغ بہادروں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بہادر ہیں مگر آپ کے ذہنوں میں جلا نہیں تو آپ اسلام کے کسی کام کے نہیں۔ آزادانہ تنقید و تحقیق آپ کو بہادر بھی بنائے گی اور آپ کے اذہان کو منور بھی کرے گی اور یہی کالج میگزین کے اجراء کا موقعہ ہے خدا ہمیں اس میں کامیاب کرے۔ آمین"

پیغامِ صدر

عزیز از جان برادران!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ یہ سال تمام بھائیوں کو اور ان کے اہل و عیال کو مبارک فرمائے خوشیوں اور برکتوں والا ہو۔ کرونا کی وجہ سے تنظیمی سرگرمیوں میں کئی روکاوٹوں کے باوجود ہمیں کئی کامیاب پروگرام منعقد کرنے کی توفیق ملی جس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں اور ان تمام دوستوں کا بھی شکریہ ہم پر واجب ہے جنھوں نے انتظام میں تعاون کیا اور ان کا بھی جنھوں نے ان میں حصّہ لیا۔ نئے سال کا آغاز بھی وقت کا ایک موڑ ہے جہاں سے ہم ماضی پر نگاہ دوڑا کر اپنے مستقبل کے پروگرامز بناتے ہیں اور جہاں بہتری کی ضرورت محسوس کی جائے اس کی تیاری کرتے ہیں۔

جدید ایجادات کی بدولت ہم سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دنیا بھر سے تنظیموں کی ورچوئل ملاقاتیں سے گھر بیٹھے استفادہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح تنظیم کے کئی پروگرام مشاعرہ، میٹنگ، بزرگان کے ذکر پر مشتمل یادگاری آن لائن میٹنگز بھی کرنے کی توفیق ملی اور ان کی رپورٹس المنار میں بھی پیش کی جاتی رہیں۔

ٹکوسا کے کاموں میں علاوہ ان سماجی سرگرمیوں کے پاکستان میں مستحق طلبہ کے لئے مالی اعانت اور افریقہ میں چند پراجیکٹس ہیں اس کے ساتھ ایک اہم کام تعلیم الاسلام کالج کی روایات کو اپنی اگلی نسلوں میں منتقل کرنے کا کام بھی ہمیں سونپا گیا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سال امر پر پوری توجہ دیں اور ٹکوسا میں زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو شامل کر کے اپنے پیارے آقا ایدّہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق بخشے۔ آمین

مالی طور پر بھائی بڑی محبت اور اخلاص سے اعانت فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اموال اور نفوس میں برکت ڈالے اور ان کے نیک نمونہ پر دوسروں کو بھی عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ جیسا کہ بار بار اعلان کیا جا چکا ہے کہ اب آپ ٹکوسا کی کسی بھی مد میں اپنے عطیّات جماعت کی رسید بکس پر اپنے حلقہ میں ہی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ رسید بک میں TSF برائے ٹکوسا سکالرشپ فنڈ اور TMF کی مد برائے ٹکوسا ممبر سپ فنڈ کے لئے مخصوص ہے جو ہاتھ سے ہی فی الحال لکھا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا ہر آن حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔

والسلام

آپ کی دعاؤں کا محتاج

خاکسار عبدالغفور ڈوگر

صدر۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ جرمنی

اداریہ

قارئین کرام!

المنار جرمنی سال 2022 کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں احباب کے ہر بار جو نئے مشورہ جات ملتے ہیں ان کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے اور بہتر بنانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں مضامین کا انتخاب کرتے وقت ماضی کی یادوں کے ساتھ ساتھ حال کے واقعات پر بھی احباب کی طرف سے مضامین میں روشنی ڈالی جاتی ہے اور حتی المقدور نظم و نثر میں بھی توازن قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ الحمد للہ ہمارے مضمون نگار بھی سابق طلبہ کی طرح دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح آجکل آن لائن بھی اولڈ بوائز ماشاء اللہ بڑے ایکٹو ہیں۔ بعض بوائز عمر کی سینچری کو پورا کرنے کے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سینچری کے بعد بھی صحت و سلامتی والی عمر سے نوازے۔ درخواست ہے کہ المنار کے ذریعہ احباب سے اپنی یادوں کو شئیر کریں۔ جتنا بھی تحریر کر سکیں ضرور کریں ہمیں اس سے خوشی ہو گی۔

مکرم پروفیسر طفیل صاحب (چوہدری انیس احمد صاحب کے بھائی) نے ایک بار ساہیوال میں ملاقات کے دوران خاکسار کو بتایا تھا کہ ایک دفعہ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ فلاں کتاب کا خلاصہ نکال کر لائیں۔ خلاصہ پیش کرنے کے بعد ایک دوسری کتاب کے خلاصہ کا حکم ہوا۔ پھر تیسری۔ علیٰ ھذا القیاس۔ اس طریقہ سے آپ نے مکمل روحانی خزائین کا مطالعہ کروادیا۔ یہ روایت بیان کر کے انہیں آپؒ کے اندازِ تربیت پر بے حد خوشی ہو رہی تھی جو سچی محبت اور اپنے عزیزوں کی فلاح خواہی کی ایک مثال ہے۔

مکرم پروفیسر حمید احمد صاحب المنار کی ترتیب اور تدوین کے سلسلہ میں ٹکوسا کی آن لائن میٹنگز میں خاکسار کی حقیر کاوش کو حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین۔ خاکسار ان کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ اس رسالہ میں بعض مضامین ستر سال قبل چھپنے والے المنار سے بھی لیے گئے ہیں۔ آج ہم اُس دور کے علمی اور ادبی معیار کو تو شاید نہ پہنچ سکیں تاہم پرانے شماروں میں کثرت سے مضامین ایسے ہیں جن کو بارِ دگر طبع کر کے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس دور کے طلبہ کے ذہن میں ماضی کی یادوں کا تازہ ہونا بھی فرحت انگیز ہو گا۔

مکرم برادرم نوید حمید صاحب خاکسار کے ان خاموش محسنوں میں سے ہیں جو نہایت باریک بینی سے جائزہ لے کر رسالہ کی تدوین ، اس کے مواد اور گیٹ اپ کی بہتری کے لئے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے ہیں۔ ان کے لئے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ انکے علم و ہنر میں برکت ڈالے اور انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار

محمد کولمبس خاں مدیر اعلیٰ المنار جرمنی

چند دن جو گزارے ربوہ میں

مکرم عبدالغفور ڈوگر صاحب صدر ٹکوساجرمنی کو سال گزشتہ کے آخر میں پاکستان ربوہ میں چند ہفتے گزارنے کی توفیق ملی۔ انہوں نے اس دوران روزانہ باقاعدہ رابطہ رکھا اور مرکز سلسلہ میں جماعت کے عہدیداروں سے ملاقاتیں اور حال احوال سے وٹس ایپ کے ذریعہ ہمیں آگاہ کرتے رہے۔ ربوہ شروع دن سے ہی ایک تعلیمی مرکز ہے اور جماعت کے تمام تعلیمی ادارے جو کم و بیش نصف صدی حکومت پاکستان نے نیشنلائز کیئے تھے لیکن جب پاکستان میں ڈی نیشلائیزین کا دور آیا تو جماعت احمدیہ کے اداروں کی اس وقت جو قیمت متعیّن ہوئی اس سے بھی کئی گنار قم کا مطالبہ کیا گیا جس کی فوراً ادائیگی بھی کر دی گئی لیکن یہ ادارے جماعت کو واپس نہ کیئے گئے۔ تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر جماعت نے اپنا جو متبادل انتظام شروع کر رکھا تھا اس میں دن بدن بہتری لائی جاتی رہی اور آج یہ پھر ایک بار اعلیٰ معیار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں عام طلبا کے علاوہ ایسے طلبا کے لئے بھی سکول قائم ہیں جو اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے مخصوص توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ مکرم ڈوگر صاحب کی مرسلہ فوٹوز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ربوہ میں شدید مشکلات کے باوجود تعلیم کے میدان میں ہر قسم کی سہولتوں سے آراستہ ہے اور رپورٹس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ربوہ کے طالب علموں میں علم کی پیاس بجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ پاکستان کے اس وقت

کے حالات میں گزارہ کرتے ہوئے بچوں کی ذہانت کو پروان چڑھایا جارہا ہے۔ خدا وہ دن لائے جب پاکستان میں انسانیت اور مساوات رواج پاسکے۔ آمین۔

محترم ڈوگر صاحب اپنی مادر علمی کی زیارت کو بھی گئے اور پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج ربوہ سے ملاقات کی جنہوں نے بڑے احترام سے پذیرائی بھی کی۔ معلوم ہوا ہے کہ ان صاحب کا اب تبادلہ ہوگیا ہے۔

محترم ڈوگر صاحب جماعت کے دفاتر میں جاکر محترم وکیل اعلیٰ صاحب تحریک جدید مکرم منصور احمد خاں صاحب، قائمقام ناظر اعلیٰ مکرم ملک خالد مسعود صاحب، مکرم ناظر صاحب تعلیم اور جماعت کے دیگر بزرگان سے بھی ملے اور تعلیم کی صورتحال کا بھی مطالعہ کیا۔

ٹکوساجرمنی کو گزشتہ برس تعلیمی وظائف کے لئے کچھ قربانی کی توفیق ملی۔ خدمت کے اس میدان میں اب برطانیہ اور امریکہ کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشنز میں شامل ہوگئی ہیں۔ اور نمایاں قربانی کررہی ہیں۔ سال 2022 کے لئے ابھی سے کوششیں شروع ہوگئی ہیں۔ اس نیکی کے کام میں سابق طلبہ کے علاوہ وہ احباب بھی قربانی کرنے لگے ہیں جو اگرچہ تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم تو نہیں رہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے اموال ونفوس میں برکت ڈالے اور ان کے صدقہ جاریہ کو قبولیّت سے نوازے۔ آمین۔

پرنسپل صاحب کے ہمراہ ان کے دفتر میں

NASIR ELEMENTARY SCHOOL

NASIR ELEMENTARY SCHOOL

نصرت جہاں کالج

صدیق بانی بلاک
نصرت بالزغب

تعلیم اسلام کالج اولڈ ایسوسی ایشن جرمنی

سال 2021 کی سرگرمیوں کا خلاصہ

(از مکرم منصور احمد صاحب جنرل سیکریٹری۔ ٹی آئی کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی)

عزیز ممبران تعلیم اسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی!

اُمید ہے آپ سب بخریت ہونگے۔ اللہ تعالی ہمیں حضور ایدہ اللہ تعالی بنصرہ العزیز کے ارشادات کے مطابق خدمت دین و دنیا کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور آپ سب کے تعاون سے ہماری ایسوسی ایشن کی عاجزانہ مساعی کی ایک جھلک سال 2021 پیش خدمت ہے

1-مورخہ 31 دسمبر 2020 کو مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر مبارک عابد صاحب کی۔ اور اسے دنیا بھر میں سراہا گیا۔ الحمدللہ

2- مجلس عاملہ کا اجلاس Zoom پر ہوا نئے سال 2021 کے پروگرام ترتیب دیئے گئے۔

3-فروری 2021 وکیل اعلےٰ تحریک جدید پروفیسر چوہدری حمید اللہ صاحب کی وفات پر ایک اجلاس Zoom پر ان کی یاد میں منعقد کیا گیا اور قراردادِ تعزیت منظور کی گئی۔

4-افریقہ میں سکول تعمیر فنڈ کے وعدہ جات اور ادائیگی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

5-فروری 2021 میں ممبران کی تعداد میں اضافہ کا پروگرام بنایا گیا۔ ہمبرگ کے علاقہ میں مکرم اعزاز رسول صاحب کی مساعی سے ایسوسی ایشن میں پانچ نئے ممبران کا اضافہ کیا۔

6-مارچ 2021 میں دوسرا عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں سابقہ طلباء تعلیم الاسلام کالج نے بھرپور حصّہ لیا۔

7-خوش الحانی سے نظم پڑھنے کا ایک مقابلہ ہوا جس کی صدارت مولانا حیدر علی ظفرؔ صاحب نے کی اور مولانا عبدالباسط طارق صاحب نے بطور منصف فرائض سرانجام دیئے۔

8-اپریل 2021 کو "الناصر" (انصار اللہ جرمنی کا رسالہ) میں قدیم طلبا تعلیم الاسلام کالج ایسوسی ایشن جرمنی کا تعارف کروایا گیا۔

۹-اپریل 2021 کو Hummanity First کے صدر صاحب سے ملاقات کی اور خدمتِ خلق کے کام میں تعاون کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔

10-11 اپریل 2021 کو یوکے اور جرمنی کی قدیم طلبائے تعلیم الاسلام کالج ایسوسی ایشنز کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔

11- قرارداد تعزیت بروفات محترم چوہدری حمید اللہ صاحب الفضل میں شائع کروائی گئی۔

12-6. جون کو ایک سائیکل ٹور منعقد ہوا جس میں 35 دوست شامل ہوئے۔

13۔جون 2021 کو Ticosa ممبران عبدالرزاق ڈوگر، عطاءالعزیز، عبدالقدوس خان، عبدالحنان ڈوگر اور مکرم مقصود باجوہ صاحب نے فرینکفرٹ سے Rüdesheim تک سائیکل ٹور کیا۔

14-جولائی 2021 کو عید ملن پارٹی منعقد ہوئی جس میں مولانا حیدر علی ظفر صاحب اور مولانا مکرم صداقت احمد صاحب بھی شامل ہوئے ممبران نے کالج کی یادیں شئیر کیں۔ ہمبرگ میں بھی یہ پروگرام کیا گیا۔

15- ستمبر 2021 سید طالع احمد صاحب کی شہادت پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی اور حضور اقدس کی خدمت میں ارسال کی گئی۔

16- ستمبر 2021 میں کورنا کی صورت حال بہتر ہونے پر ایک شاندار گرل پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ کثرت سے ممبران دُور دُور سے شامل ہوئے۔

17- ستمبر 2021 میں مزید ایک ملین روپے سکالرشپ فنڈ میں مرکز کو ارسال کئے گے اس طرح سال گزشتہ میں تین ملین پچاس ہزار روپے سکالرشپ فنڈ میں ادا کرنے کی توفیق ملی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

18-اکتوبر 2021 میں حضور اقدس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز کی طرف سے ایک دعائیہ خط صدر ایسوسی ایشن کے نام موصول ہوا۔ اس میں ممبران ٹکوساجرمنی کے نفوس اور اموال میں برکت کی خاطر انہیں دعاؤں سے نوازا گیا۔ اللہ کرے ہم ان دعاؤں کے حقیقی وارث بنیں۔ آمین

19-نومبر 2021 کو مکرم صدر صاحب ایسوسی ایشن جرمنی نے مرکز سلسلہ ربوہ میں حاضر ہو کر تعلیمی اداروں کا تعارف حاصل کیا جہاں انہیں مورخہ 20 دسمبر 2021 کو نظارت تعلیم کی طرف سے ایک تعلیمی اداروں کی Presentation دکھائی گئی۔ ان کی رپورٹ المنار میں الگ پیش خدمت ہے۔

21- مورخہ 25 دسمبر 2021 میں ایسوسی ایشن کو ایک عالمی مشاعرہ منعقد کرنے توفیق ملی جس کی صدارت مکرم مبارک احمد عابدؔ صاحب نے کی۔ یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ یہ ایک لحاظ سے اس سال کا آخری پروگرام تھا۔ جس کے بعد جنوری 2022 کے آغاز میں عاملہ کی ایک آن لائن میٹنگ منعقد ہوئی۔

خاکسار تمام ممبران کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ کرونا سے متاثر حالات میں بھی آپ کے تعاون اور پیارے آقا حضور ایدہ اللہ کی توجہ اور دعاؤں سے تنظیم میں زندگی کی رو بہتی رہی اور ان پروگرامز کا انعقاد ممکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ پیارے آقا ایدہ اللہ تعالیٰ کو صحت والی لمبی زندگی دے اور خلافت کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین

آخر پہ نہایت پیارے محترم استاد پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب کی صحت کے لئے درخواست دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے اور ان کی سرپرستی سے ہم استفادہ کرتے رہیں۔ آمین

ٹکوسا جرمنی کا مالی نظام

جیسا کی احباب کے علم میں آچکا ہے کہ ہمارے پیارے آقا سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز نے ٹکوسا کا مال انتظام جماعت احمدیہ جرمنی کی نگرانی میں دے دیا ہے۔ اب ہر ایک دوست کسی بھی مقامی جماعت میں ٹکوسا کا ممبر شپ کا چندہ، ٹکوسا سکالرشپ فنڈ اور افریقہ میں سکول کی تعمیر کے لئے چندہ جماعتی رسید بک پر ادا کر سکتا ہے۔ ممبر شپ فنڈ ابھی بیس یورو سالانہ ہے اور سکالرشپ فنڈ حسب توفیق ہے۔ معاونین خصوصی تین صد یورو یا زائد رقم سالانہ ادا کرتے ہیں۔ سال 2022 میں ممبران کی تعداد میں بھی اضافہ کی خصوصی کوشش کی جائے گی اور حضور انور ایدّہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل میں اگلی نسل کے بچوں کی ممبر شپ میں بھی اضافہ کیا جائے گا۔ جس کا بنیادی مقصد تعلیم الاسلام کالج کی روایات کو زندہ رکھنا اور اگلی نسلوں میں منتقل کرنا ہے۔ ٹکوسا جرمنی کو پہلے سال ڈیڑھ لاکھ سے بیس گنا بڑھ سال گزشتہ میں تیس لاکھ پچاس ہزار روپے سکالرشپ فنڈ میں ادا کرنے کی توفیق ملی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ پاکستان میں مہنگائی بڑھ رہی ہے اس لئے ان شاء اللہ اس سال اس مد میں معتدبہ اضافہ کرنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قربانیوں کو قبولیت سے نوازے اور بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین

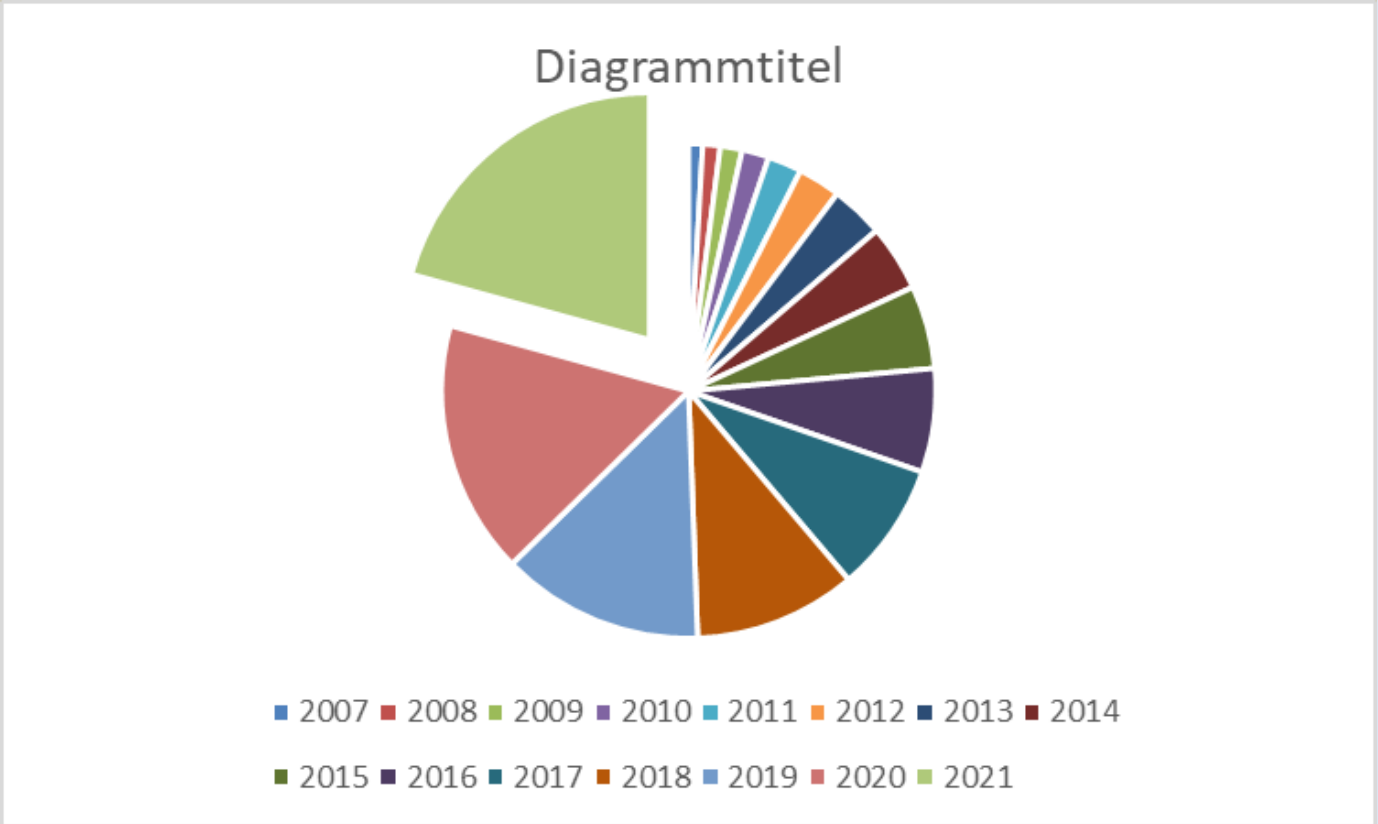

فحش گوئی اور نعرۂ تکبیر

ایک چشم دید و گوش شنیدہ منظر سے متأثر ہو کر

ہماری جان فدا سید الوراءؐ کے لئے
سبھی نثار ہیں اس شاہِ دوسراؐ کے لئے

بروئے کار ہے شیطاں نقاب بر انداز
"بدی" کو "خوب ہے" "ہم کیوں کہیں ریا کے لئے

طریق شرع نہیں اسوۂ رسولؐ نہیں
مقام شرم ہے یہ "غول" اتقیا کے لئے

نبیؐ کے نام مقدس کی آڑ لے لے کر
وفا کی شان دکھانے چلے جفا کے لئے

جو رہن ہو چکی ابلیس کے خزانے میں
وہ "روح" نذرِ شہنشاہِ انبیاءؐ کے لئے؟

دہان کھلتے ہی اڑتی ہے بوئے طاغوتی
نہیں! یہ لب نہ ہلیں ذکرِ مصطفیٰؐ کے لئے

یزیدی فعل زبانوں پہ "یا علی" توبہ
یہ اور تیر چلے آل مرتضیٰ کے لئے

(درِعدن)

مجلسِ عرفاں

بہبود ہست و بود کا سامان لئے ہوئے
سارے جہاں کے درد کا درماں لئے ہوئے

عشقِ گداز کی بیتابیوں کے ساتھ
حُسنِ کرشمہ ساز کا طوفاں لئے ہوئے

زہد و ورع کے ہاتھ سے تھامے ہوئے عناں
رخشِ جہاں کو جانبِ ایماں لئے ہوئے

سوز و گدازِ عشق کی زرّیں کتاب میں
بابِ وصال حضرتِ سبحاں لئے ہوئے

توراتِ دِلفریبیِ تقویٰ کے ماسوا
انجیلِ دِلنوازیِ رضواں لئے ہوئے

کشتِ نخیلِ مہدیِ دوراں کے واسطے
ابرِ عطیرِ رحمتِ یزداں لئے ہوئے

بزمِ جہاں میں مِلّتِ احمد کا تاجدار
جلوہ نما ہے دولتِ قرآں لئے ہوئے

مصلحؔ درِ وصال ہے مدّت سے وا ہوا
اُٹھ تو بھی چل جراحتِ ہجراں لئے ہوئے

فیض احمد فیض

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

جس کی الفت میں بھُلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہے ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے

کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے

تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس حرماں کے، دکھ درد کے معنی سیکھے

زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

کیہ دساں

پیر فضل حسین گجراتی

پیر فضل حسین فضل گجراتی (پیدائش: یکم جنوری، 1896ء – وفات: 22 اگست، 1972ء) پاکستان سے تعلق رکھنے والے پنجابی زبان کے ممتاز شاعر اور حضرت شاہ دولہ دریائی گجراتی کے سجادہ نشین تھے۔

انہیں جدید پنجابی غزل کا بانی کہا جاتا ہے۔(1896۔1972)

میں کیہڑی آپنے درداں دی دُنیا وچہ وَساں، کِیہ دساں
کِس گلّے پیّاں رورو کے چہرے تے لسّاں، کِیہ دساں

میں ٹریا جنگل بیلے نوں اوہ حَبل ورِیدوں نیڑے سی
اِک پانے والے پایاں سن کجھ پُٹھیاں دسّاں، کِیہ دساں

اوہ عشق نئیں جو لگ جائے تے گو رُ ریڑے لہہ جائے
ایہہ چڑھیاں ہویاں فیر کدی لتھیاں نئیں کسّاں، کِیہ دساں

رنگ کُھلا میری وحشت دا، ہو کٹھے کجھ ہمدرد گئے
اوہ رورو پُچھن حال میرا، میں کِھڑ کِھڑ ہسّاں، کِیہ دساں

کیوں فضل سودائی ہویا ایں، پلّے دیاں لیر اں لاہیاں نی
پھڑ لو کی پلّہ پُچھدے نیں تے میں پلّہ کھساں، کِیہ دساں

موجِ بہار، لالہ و گلزار کیا ہوئے
وہ دلفریب موسمِ اقرار کیا ہوئے

اِس ابتری میں اہلِ نظر بھی ہیں دم بخود
وہ جانثار صاحب کردار کیا ہوئے

مطلوب ہم سے جان و دل و مال و آبرو
سرکار نے کئے تھے جو اقرار کیا ہوئے

محشر میں آج پھرتے ہیں بے چین و بے قرار
سوچا ہے! آپ کے وہ پرستار کیا ہوئے

وحشت، فراق، رتجگے، ملبوس تار تار
کیفِ جنوں کے آگے یہ آزار کیا ہوئے

لطف و کرم کی بارشیں ہونے لگیں نصیب
دُنیائے بے ثبات سے بیزار کیا ہوئے

واعظ کو دل پسند مضامین مل گئے
عشقِ بتاں میں یار گرفتار کیا ہوئے

یوسفؑ تھے ایک گوشۂ خلوت میں پُر سکون
تیماردار آ گئے، بیمار کیا ہوئے

سائے میں تیرے دھوپ نہائے بصد نیاز
اے چھاؤں چھاؤں شخص تیری عمر ہو دراز

اے اپنے ربّ کے عشق میں دیوانے آدمی
دیوانے تیرے ہم کہ ہوا تو خدا کا ناز

کیوں کر کھلے خدا جو نہ دیکھو وہ آدمی
سجدہ کرے زمیں پہ تو ہو عرش پر نماز

آیا زباں پہ اسم گرامی کہ بس ادھر
پر نم ہوئی وہ آنکھ وہ سینہ ہوا گداز

اتنی ہی اس چراغ کی لو تیز ہو گئی
جتنی بڑھی ہوائے مخالف میں سازباز

اس پر ہے ختم اس سے ہی جاری ہے روشنی
اک در خدا نے بند کیا سو کئے ہیں باز

ہر جام عشق اس کے ہی لب سے ہے لب بہ لب
شائد ابھی یہ راز ہے شائد رہے نہ راز

دیتا ہے بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
ہر دور کو ہے ساقیِ کوثر پہ اپنے ناز

کیا قائد اعظم اور مودودی صاحب کے نظریات ایک جیسے تھے؟

(ازابونائل 18 نومبر 2021۔ بشکریہ ہم سب)

حال ہی میں محترم الطاف حسن قریشی صاحب کا ایک کالم "اسلامی ریاست قائد اعظم کے عالی شان تصورات" کے نام سے ہم سب پر اور 12 نومبر کے روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ اس کالم کے آغاز میں قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"1949 کی طرح آج بھی کچھ تجزیہ نگار یہ تاثر دیتے رہتے ہیں کہ قائدِاعظم برِصغیر میں ایک مسلم قومی ریاست قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے، لیکن نوابزادہ لیاقت علی خان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی ریاست کا نعرہ بلند کر کے بہت بڑا ذہنی خلجان پیدا کر دیا تھا جس کے باعث پاکستان پس ماندگی کا شکار ہوتا گیا۔"

اس کے بعد وہ کچھ حوالے درج کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ریاست کے بارے میں قائد اعظم اور مودودی صاحب کے خیالات بالکل

ایک جیسے ہی تھے۔ اور دونوں ایک ہی سمت میں قوم کی راہنمائی کر رہے تھے۔ جہاں تک قائد اعظم کے نظریات کا تعلق ہے تو جیسا کہ الطاف حسن قریشی صاحب نے بھی حوالہ پیش کیا ہے قائد اعظم جب بھی اسلامی اقدار پر قائم ریاست کا ذکر کرتے تھے، اس سے ان کی مراد ایسی ریاست ہوتی تھی جو جمہوریت اور سب کے لئے برابر حقوق کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اور اس میں کسی مخصوص مذہبی گروہ کو اجارہ داری حاصل نہ ہو لیکن کیا مودودی صاحب کے بھی یہی نظریات تھے؟۔ یقینی طور پر الطاف حسن صاحب نے ایک حوالہ پیش کیا ہے۔ لیکن کیا یہ ایک حوالہ مودودی صاحب کے نظریات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے؟۔ اس کالم میں ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔

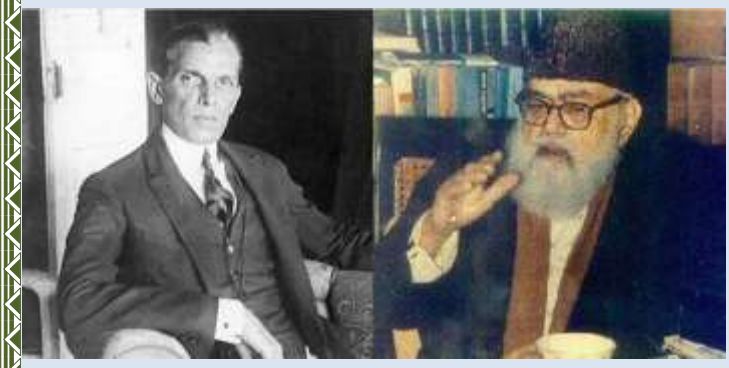

اس سوال کے بارے میں کہ کیا ایک اسلامی ریاست میں کوئی غیر مسلم اہم عہدوں پر فائز ہو سکتا ہے کہ نہیں مودودی صاحب نے اس نظریہ کا اظہار کیا:

"رہے سول محکمے تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین و تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں بہر حال اہل ذمہ کو نہیں دیے جا سکتے"۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص 264)

مودودی صاحب کی یہ تحریر پڑھیں اور خود فیصلہ فرمائیں کہ کیا یہی قائد اعظم کے نظریات تھے۔ جنہوں نے ایک غیر مسلم کو پاکستان کا پہلا وزیر قانون مقرر کیا تھا۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ قائد اعظم نے 11 اگست کو یہ اعلان کیا تھا کہ آپ کا جو بھی مسلک یا عقیدہ ہو اس کا ریاست کے امور سے کوئی تعلق نہیں۔ مودودی صاحب نے تو یہ کہا تھا کہ وہ جس ریاست کا تصور پیش کر رہے ہیں، اس میں کسی غیر مسلم کو کوئی کلیدی عہدہ نہیں دیا جا سکتا۔

یہ تو واضح ہے کہ قائد اعظم پاکستان کے لئے ایک جمہوری نظام چاہتے تھے لیکن کیا مودودی صاحب بھی یہی چاہتے تھے؟ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ جمہوری نظام میں جو جماعت اکثریت حاصل کرے وہی حکومت کرتی ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب اپنی مشہور کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے حصہ سوئم میں مودودی صاحب یہ نظریہ پیش کرتے ہیں۔

"جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور کسی جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور

قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف 32 لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے 17 کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی 4 لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت 3 لاکھ تھی مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم ص 45)

ظاہر ہے کہ اس میں مودودی صاحب کسی جمہوری نظام کا نظریہ پیش نہیں کر رہے۔ بلکہ وہ یہ نظریہ پیش کر رہے ہیں کہ ایک قلیل تعداد کا گروہ صالحین مسولینی کی فاشسٹ اور ہٹلر کی نازی پارٹی کی طرح زبردستی اقتدار پر قبضہ کر کے اکثریت پر حکومت کرے گا۔ کیا قائد اعظم نے یہی نظریات پیش کئے تھے؟

جب قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ پاکستان کا نظریہ پیش کر رہی تھی، مودودی صاحب بھی ان نظریات کے مقابل پر اپنے نظریات پیش کر رہے تھے۔ اس مرحلہ پر انہوں نے ان الفاظ میں قائد اعظم اور مسلم لیگ کے ممبران کو یاد کیا:

"مگر افسوس لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم ص 30)

اگر مودودی صاحب اور قائد اعظم کے بنیادی نظریات بھی ایک ہوتے تو مودودی صاحب کو یہ لکھنے کی ضرورت نہ پیش آتی ہے کہ ان لوگوں کو تو یہ بھی نہیں علم کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ غیر مسلم تو ایک طرف رہے، مودودی صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کی کثرت رائے پر حکومت چلا کر بھی اسلامی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

"یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔۔۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔)" مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم ص 107)

اور جب پاکستان بن گیا اور قائد اعظم اپنی طویل جدوجہد کے بعد اپنی زندگی کے آخری دن گذار رہے تھے۔ اس وقت مودودی صاحب نے یہ بیان دیا

"دوسرے یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے، اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے قوم سے کئے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔" (رسائل و مسائل حصہ اول ص 334و335)

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے کہ قائد اعظم اور مودودی صاحب کے نظریات بالکل ایک تھے؟ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک قائد اعظم اور مسلم لیگ کی قیادت کو چاہیے تھا کہ وہ یہ تسلیم کر لیں کہ اب ہم اس قابل کہاں کہ ملک کو اسلامی نظریات کے مطابق چلائیں۔ اب ان کا یہ فرض تھا کہ وہ اقتدار ایک مخصوص مذہبی طبقہ کے سپرد کریں اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو جائیں کہ ہمارا کام تو صرف پاکستان بنانا تھا۔ اب اس کو چلانے کا کام ان کے سپرد ہونا چاہیے جو کہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔

احمدیت کے بارے میں برداشت کی روایت کیوں ختم ہوئی؟

از ڈاکٹر ساجد علی بشکریہ "ہم سب" یکم دسمبر 2021

ڈاکٹر صوفی محمد ضیاالحق صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے صدر شعبہ تھے۔ وہ عربی زبان، بالخصوص عباسی عہد کی عربی کے بہت جید عالم تھے۔ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود صوفی صاحب لکھتے نہیں تھے۔ جب کبھی طالب علم ان سے استفسار کرتے کہ آپ لکھتے کیوں نہیں ہیں تو صوفی صاحب بڑے مزے کا جواب دیا کرتے تھے۔ فرماتے قرآن حکیم میں اللہ نے کہا ہے اقرا۔ اللہ نے پڑھنے کا حکم دیا ہے، لکھنے کا نہیں اور میں پڑھ رہا ہوں۔ ایسے محترم اساتذہ کی باتیں ہم جیسے نالائق شاگردوں کا بہت بڑا سہارا ہوتی ہیں۔ دوست احباب اور شاگرد جب کبھی مجھ سے لکھنے کا تقاضا کرتے تو میں صوفی صاحب کا یہ جواب سنا کر جان چھڑا لیا کرتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بعض دوستوں کی انگیخت اور وجاہت مسعود صاحب کی عنایت سے کچھ لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم سب پر میری تحریریں تقریباً پانچ برس سے شائع ہو رہی ہیں۔ اس اشاعت برقی کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ قاری کے رد عمل سے فوری طور پر آگاہ ہو جاتے ہیں۔ میں ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے بہت حوصلہ افزا رد عمل دیا۔ اس کے باوجود بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض قارئین کی نظر سے رد عمل دیتے وقت تحریر کا بنیادی نکتہ نظر انداز ہو جاتا ہے۔ ہم سب پر میری ایک تحریر بعنوان احمدیت: "برداشت سے عدم برداشت" تک شائع ہوئی تھی۔ اس تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ باوجود یکہ ختم نبوت اسلام کا اساسی عقیدہ ہے، کیا وجہ تھی کہ مرزا صاحب کی وفات کے تیس برس بعد تک بھی بڑے بڑے علما احمدیوں کو مسلمانوں کا فرقہ تسلیم کرتے رہے۔ یہی وہ بات تھی جو کمنٹس میں نمایاں نہ ہو سکی۔ اس وقت تک احمدیوں کے خلاف جو تحریریں چھپتی تھیں وہ ویسی ہی ہوتی تھیں جیسا کہ باقی مسلمان فرقے آپس میں کافر کافر کھیلتے تھے۔

میں کوئی محقق نہیں بس آوارہ خوانی کی کچھ عادت ہے۔ ایک دن ڈاکٹر اختر النسا کی کتاب اقبال اور زمیندار مل گئی۔ ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب کی غرض وغایت علامہ اقبال کے متعلق زمیندار اخبار میں جو کچھ شائع ہوتا رہا، اسے جمع کرنا ہے۔ انھیں احمدیوں یا ان کے عقاید سے کوئی واسطہ نہیں۔ تاہم مطالعہ کرتے وقت مجھے کچھ صفحات پر چونکنا پڑا کیونکہ مجھے پہلی بار یہ معلوم ہو رہا تھا کہ سن 1935 بلکہ اس کے بعد بھی بڑے بڑے علما اور اسلام کے علم بردار صحافی احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں ہی کرتے رہے ہیں۔ میں ان کی کتاب سے اس بات کے چند شواہد پیش کرنا چاہتا ہوں۔

18 فروری 1912 کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مسٹر گوکھلے کے مسودہ لازمی تعلیم کی حمایت میں ہونے والے جلسے میں احمدیان لاہور کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے یہ قرارداد پیش کی:

مسلمانوں کا یہ عام جلسہ جبر کے اس عام اصول کی بڑے زور سے تائید کرتا ہے جو مسٹر گوکھلے نے اپنے مسودہ قانون تعلیم ابتدائی میں اختیار کیا ہے، اس لیے کہ یہ اصول، اسلام کے تابع ہونے کے علاوہ اس ملک کے باشندوں کی مادی اور اخلاقی فلاح کا ممد ہے۔ (ص 16)

25 اپریل 1920 کو امریکہ میں مسلمان مبلغین کے داخلے پر پابندی کے خلاف ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسے کے داعیان میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا نام بھی درج ہے۔ بلکہ ان کا نام پہلے نمبر پر ہے۔ (ص 99)

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا تعلق احمدیان قادیان کے ساتھ تھا۔ وہ لاہور میں مسلمانوں کی تمام ثقافتی، سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ اپنی وفات (1936) تک انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن رہے۔ وفات سے نو دس دن پہلے انجمن کی میٹنگ میں ان کا ختم نبوت کی تشریح پر کچھ اختلاف ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ان کو انجمن سے نکالا نہیں گیا تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب

زندہ رود جلد سوم کے صفحات 559-60 پر مندرج ہیں۔

22 جنوری 1927 کو بعض آریہ سماجی اخبارات مثلاً پرتاپ اور ملاپ کے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا جواب دینے کے لیے ایک جلسہ عام کا اعلان شائع ہوا جس کے داعیان کے اسما کی فہرست میں ماسٹر فقیر اللہ صاحب، سیکریٹری احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا نام بھی موجود ہے۔(ص 100)

جب سوامی شردھانند کا قتل ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے پروپیگنڈے میں بہت تیزی آگئی جس کا جواب دینے کے لیے 22 جنوری 1927 کو موچی دروازے میں فرزندان توحید کا اجتماع ہوا۔ زمیندار اخبار کی رپورٹ کے مطابق "اس جلسے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تمام فرقوں کے مسلمان اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کفر کے مقابلے میں اسلام کی عزت کی حمایت کے لیے دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوبندی، حنفی، حزب الاحناف، شیعہ، احمدی، اہل حدیث، جدید تعلیم یافتہ؛ غرض تمام طبقوں اور فرقوں کے مسلمان موجود تھے۔(ص 106)

29 جنوری 1927 کو مسلمانان لاہور کے جلسے کا اعلان شائع ہوا۔ اس جلسے کی صدارت علامہ اقبال نے کرنا تھی اور مقررین میں مولانا غلام مرشد اور مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کے اسما درج تھے۔(ص 101)

سماجی آریہ اخبارات مثلاً ملاپ اور پرتاپ نے مسلمانوں کے خلاف جو پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا اس کا جواب دینے کے لیے 22 مارچ 1927 کو باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک جلسہ عام کا اعلان شائع ہوا جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ اس میں ہر طبقے کے مسلمان شریک ہوں گے۔ اس جلسے کے داعیان میں یہ لوگ شامل تھے: علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا احمد علی وغیرہم کے ساتھ ماسٹر فقیر اللہ، سیکریٹری احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کا نام بھی شامل تھا۔(ص 100)

4 مارچ 1927 کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مرزا بشیر الدین محمود نے سائنس اور مذہب کے موضوع پر تقریر کی۔ صدارت علامہ اقبال نے کی۔(ص 23)

13 مئی 1927 کو لاہور کے ہندو، سکھ اور مسلمان نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، مسلمانوں کے نمائندوں میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا نام بھی درج ہے۔(ص 108)

انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ تیس مارچ تا یکم اپریل 1923 کو منعقد ہوا۔ اس میں جن علما نے خطاب کرنا تھا ان کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں: سید سلیمان ندوی، مولوی ابو الوفا ثنا اللہ امرتسری، مولوی اصغر علی صاحب روحی، مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور اور مولوی احمد علی امام مسجد دروازہ شیرانوالہ، لاہور۔ ان ناموں میں سب سے دلچسپ نام مولانا ثنا اللہ امرتسری کا ہے۔ وہ مرزا غلام احمد صاحب کے ساتھ مناظرے کرتے رہے تھے بلکہ مرزا صاحب کی زندگی کا آخری مناظرہ انھی کے ساتھ ہوا تھا۔ اس بنا پر انھیں فاتح قادیان کا لقب دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود مرزا صاحب کی وفات کے پندرہ برس بعد بھی امیر جماعت احمدیہ لاہور کے ساتھ جلسے سے خطاب کرنے میں انھیں کوئی عار نہیں تھا۔

مولانا ظفر علی خان کی 1926 کی نظم کا ایک مصرع ہے:

مجھ سے ناراض رضائی بھی ہیں، مرزائی بھی

مرزا صاحب کی وفات کو ایک سو تیرہ برس گزر چکے ہیں۔ ظاہر ہے احمدیوں نے اس عرصے میں کوئی نیا دعویٰ تو نہیں کیا ہو گا۔ چلیے اچھا ہوا کہ قومی اسمبلی نے انھیں غیر مسلم بھی قرار دے دیا۔ اس کے باوجود ہم ان کو گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں، ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کر رہے ہیں۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ اگر مرزا صاحب کی وفات کے تیس برس یا اس سے زائد عرصہ تک بھی مسلمان احمدیوں کے ساتھ امن و آشتی سے رہ رہے تھے، بھلے ان کے خلاف فتوے بازی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ امن سے رہنے بلکہ ان کا وجود بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

میرے لئے وہی کافی رہا ورنہ؟

مکرم شیخ لئیق احمد صاحب ٹورانٹو۔ کینیڈا۔ 6 دسمبر 2021۔ بشکریہ "ہم سب"

رات سونے کے لئے لیٹا تو نیند تو کیا آتی ذہن میں سامنے آگ کے اونچے روشن الاؤ کے نیچے سے انسانی پاؤں اور ارد گرد کھڑا انسانوں کے روپ میں وحشی بھیڑیوں کا گروہ رحمت للعالمین کے نام کے نعرے لگاتا انہی کی تعلیم کو سپرد آتش کرتے گندی گالیاں نکالتا گھوم رہا تھا۔ پھر آگ کے الاؤ میں بھسم ہوتے جسم کے سامنے فخر سے سیلفی بناتا مجاہد اول تھا۔ صبح بہیمانہ قتل اور میت کی "عزت" سنتے ہی منہ سے "بیچارہ کسی جونئیر سے پھڈا کر بیٹھا ہوگا" کے الفاظ نکلے تھے۔ اب یہ آگ میری مندی آنکھوں میں دھوئیں کی صورت اختیار کرتی سینتالیس سال پیچھے لے جا ان مرغولوں کی سکرین ایسی ہی گزری یادوں کے "ٹوٹے" لا رہی تھی۔ اور یاد دلا رہی تھی کہ خدا کا فضل شامل حال رہا ورنہ...

تیس مئی چوہتر کو اپنی ریل بازار پولیس چوکی فیصل آباد کے بالکل سامنے واقع دس گھنٹہ تک شعلے اگلتی دکان کے شعلے تو نہ دیکھ سکا تھا، کوئی چار کلو میٹر دور پیپلز کالونی میں اپنے گھر کی چھت سے دور دھویں کا بگولا ہی اٹھتا سامنے آ رہا تھا۔ اور دو تین روز بعد سامنے پولیس چوکی کا تھانیدار فخریہ بتا رہا تھا کہ جناب میں نے تو بلوائیوں کو بہت کہا کہ لوٹ مار کر لو، آگ نہ لگاؤ مگر وہ باز نہ آئے۔ جبکہ موقع پر موجود میرا ملازم اسی وقت مجھے بتا چکا تھا کہ چوکی کا اکثر عملہ سادہ کپڑوں میں سامنے ٹرک اڈہ پہ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے جب کہ تین چار باوردی چوکی کی چار دیواری سے جھانک رہے تھے ورنہ چالیس پچاس شرپسندوں کو بھگانا مشکل نہ تھا۔

سین بدل چکا تھا۔ اب میری نظروں کے سامنے کسی بیرونی قصبہ سے آیا کپڑے کا دکاندار گھوم رہا تھا، جس کے کندھے پر رکھے تین چار تھان کپڑے کے ریل بازار سے پیچھے لگا بھاگتا آیا بندہ نیو کلاتھ مارکیٹ کے چند دکانداروں سے مل چھین رہے اور چند لمحے بعد سڑک کے درمیان کپڑے کے کھلے تھان آگ کے الاؤ میں تبدیل ہو چکے تھے اور ارد گرد لڈی ڈال ایک ٹانگ پہ ناچتے نعرے لگاتے دکانداروں میں چار خانہ دھوتی پہنے لمبی داڑھی والا میرے گھر سے دوسرے گھر والا ہمسایہ سب سے نمایاں تھا۔ وہ دکاندار شدید بائیکاٹ اور پکٹنگ کے باوجود مراد کلاتھ مارکیٹ کے ایک احمدی دکاندار سے کپڑا خریدنے کی سزا خرید شدہ مال جلائے جانے کے ساتھ محض چند لاتیں گھونسے کھانے کے بعد کہیں بھاگ چکا تھا اور آگ بجھانے پولیس کا عملہ پانی کی بالٹیاں لا رہا تھا۔

پھر ذہن گھوما تو محض ایک دو ہفتے کے بعد اپنے اسی ہمسائے کے سکوٹر سے پھسلنے سے گر کر اسی اٹھی ٹانگ ٹوٹنے کی عیادت کرنے کا منظر یاد آ گیا۔ باقی تمام ہمسایوں نے خطرہ کے وقت اہل خانہ کو پناہ دینے اور حفاظت اور سامان خود اپنے گھروں میں رکھنے انسانی فریضہ ایک سے بڑھ ایک ادا کیا تھا۔

اب پچھتر کا وہ دن تھا جب صوبہ کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے کی موجودگی میں سرگودھا میں لوٹ مار اور آگ کی ہولی کھیلتے سارا دن دھوئیں کے بادلوں کا تماشا لگایا گیا تھا اور فیصل آباد میں بھی مسجدوں کے لاؤڈ سپیکر کھلنے کے ساتھ پھر ہم آگ اور خون اور لوٹ مار کا نشانہ بننے کو تیار ہو چکے تھے۔ کہ کلاس فیلو چوہدری اکرم آ گئے۔ پریشانی سن کر فوراً اٹھ گئے کوئی آدھ گھنٹہ بعد فون پر مجھے بتا رہے ہیں کہ میں اپنے یونیورسٹی کلاس فیلو ایس ایس پی اور ایس مظہر کے پاس ہوں ان کے الفاظ آپ کے لئے ہیں۔ "میرا اصول ہے، پہلا واقعہ مت ہونے دو، دوسرا نہیں ہوگا۔" آپ اطمینان رکھیں۔ اگلے ایک گھنٹے سے پہلے مسلح پولیس کے دستوں پر گاڑیاں شہر کی سڑکوں پر گشت کر رہی تھیں اور لاؤڈ سپیکر خاموش کرائے جا چکے تھے۔

اور پھر چند ماہ بعد اسی اویس مظہر کا اے سی مس سروش سلطان کو تھپڑ جڑنے کی پاداش میں برخاست کیا جانا اخباروں کی سرخی تھا۔ اندر کی کہانی کون بتائے گا۔ فرض شناس ہونا بھی تو جرم ہو سکتا ہے۔

اسی کی دہائی ہے میری بیگم گھر کے مالی کو پورا معاوضہ ملنے کے باوجود پہلے کی طرح دیانتدارانہ اور لگن سے کام نہ کرنے سخت سست کہتی اور اپنا سامان اٹھالے جانے کو کہتی ہے اور وہ صبح صبح آ کے دھمکیاں لگاتا ہے کہ پولیس کو رپورٹ کرنے چلا ہوں کہ انہوں نے قرآنی آیات لکھے اخبار جلائے ہیں۔ فوراً دو ہمسائے بلاتا ہوں جن کے ہاں بھی وہ کام کرتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ کر جان چھڑواتا ہوں۔

منظر بدلتا ہے۔ پولیس افسر بس سٹینڈ کے سامنے نئی بنی میری دس مرلہ دکان میں سامنے بیٹھا میرے دفتر میں لگے میری بیٹی کے سیکرڈہارٹ سکول کی عیسائی استانی کے زیر نگرانی سفید کیپسول سے سجائے قرآنی الفاظ والے انتہائی جاذب نظر 32 x فٹ فریم کے متعلق خلاف قانون اور توہین مذہب ہونے کی رپورٹ پر تفتیش کے لئے بیٹھا ہے۔ یہی خدا مجھے ہر مصیبت سے اب تک محفوظ رکھے ان الفاظ پر یقین کے پھل سے نوازتا مجھے پینتالیس مربع فٹ کی دکان کو ایک سو اسی فٹ کی کرائے کی دکان بناتے اور پھر اس کے شعلوں کی نذر ہونے کے بارہ سال بعد بس سٹینڈ کے سامنے دس مرلہ کی تین منزلہ اس دکان پہ لا بٹھا چکا ہے۔ استانی بیٹی کو ساتھ لئے یہ طغری فخر سے سٹاف روم پورے سٹاف کو دکھا کر تعریف سمیٹ چکی ہے۔ میرے ایک بزرگ کارکن سید اعجاز حسین شاہ صاحب اس افسر کو، شاید آپ کو امام بارگاہ میں دیکھا ہوا ہے، کہہ الگ لے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد انہیں چائے پلا مجھ سے پانچ سو روپیہ لے جا ان کی جیب میں ڈالتے ہیں۔ اور وہ فریم کاغذ میں لپیٹ اگلے روز میرے گھر کی زینت ہو جاتا ہے۔ اور جب چند ماہ بعد محلہ مصطفےٰ آباد کا یہ شکایت کنندہ (ٹیڈی شاہ قسم کے نام سے معروف) آج کل کے مدرسہ و سیاست مشہور "تنظیم سازی" کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا جانے کی تصدیق ہوتی ہے تو سوچتا ہوں کہ کس طرح یہ خدا ہی میرے لئے اپنے کافی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ ورنہ...

ذہن میں جاری فلم نیا سین سامنے لے آئی ہے۔ مستری طالب حسین جس نے میری دکان اور نئی کوٹھی 120 سی پیپلز کالونی کے لوہے کی جالیاں گیٹ شٹر وغیرہ بنائے تھے کا فون بتاتا ہے کہ پیپلز کالونی تھانہ میں محرر کے پاس بیٹھے تھے کہ کوئی شکایت لگا رہا ہے کہ لئیق صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر نام کی تختی کے اوپر وہی قرآنی آیت "کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں" اپنے عربی متن میں لکھی ہمارے مذہبی جذبات کو مجروح کر رہی ہے اور شاید کوئی چیک کرنے آجائے بہتر ہے اوپر کوئی تختی لگا دی جائے۔ لہٰذا درخواست کی کہ بھائی خود جاؤ چنانچہ چند منٹ بعد خدا تعالیٰ سے مجبوری کی معافی کی دعا مانگتے اس سطر کے اوپر ٹیپ لگا کر چھپایا جا چکا تھا۔

اب وہ صبح سامنے تھی جب ہم بائیس افراد کچہری میں عدالت کے سامنے مجرم بنے بیٹھے باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم سب پر 1988 کی نماز عید الفطر اور جمعۃ الوداع مسجد کے باہر سڑک پر ادا کرنے کا الزام تھا اور بروقت اطلاع ملنے پر اکثر ضمانت قبل از گرفتاری کرانے میں کامیاب رہے تھے اور تین چار جیل یاترا کر چکے تھے۔ سامنے سے سیف اللہ احرار آتے نظر پڑے۔ موصوف اور ان کے والد محترم مولانا عبید اللہ احرار (سربراہ جماعت احرار) جس زمانے میں ان کے بی ایم سی ٹرک تھے میرے اچھے گاہک واقف کار ساتھ چائے پیتے گپ کرتے ادھار مال بھی خریدتے، وقت پر ادائیگی کرنے والے شریف النفس انسان تھے۔ علیک سلیک پر بتایا کہ جماعت احرار کی سربراہی کرتے مدعی مقدمہ وہ ہیں۔ خود بتایا کہ یار میں تو کئی ہفتے امین پور بازار گیا ہی نہیں تھا، مولانا حضرات نے پھنسا دیا۔ ہر پندرہ روز بعد تاریخ بھگتتے کوئی پونے چار سال صبح سے سہ پہر چادر بچھا کر بیٹھے کاروباری نقصان کرتے۔ جج حضرات کبھی کبھار جھلک دکھاتے، مدعی اور گواہ تسلیم کر چکے تھے کہ نماز قناتوں کے اندر ہوئی تھی اور وہ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کے بھی اندر نمازیوں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ سوائے دو چار بہت نزدیک سے پرانے جاننے والوں کے کسی کا نام بھی صحیح نہ بتایا تھا۔ کئی ماہ سیف

اللہ نظر نہ آنے کے بعد ایک دن ملے تھے تو بہت مغموم تھے بتایا کہ ان کا جوان (شاید اکلوتا) بیٹا ٹریفک حادثہ میں وفات پا چکا تھا اور اب ان کی کسی مقدمہ میں دلچسپی نہ تھی۔ کارروائی دیر ہوئی ختم تھی مگر فیصلہ نہیں سنایا جارہا تھا۔ آخر پیغام ملا کہ فیصلہ ہو چکا مگر مولانا حضرات کے ڈر سے سنایا نہیں جا رہا۔ موجودہ جج صاحب کی ہمشیرہ کی شادی ہے۔ چنانچہ دلہن کو سلامی بھجوائی گئی اور چپ چاپ بریت کا فیصلہ ہمارے ہاتھوں تھما دیا گیا۔

اب نوے کی دہائی ہے میری دونوں بیٹیاں ایم ایس سی اور بی ایس سی کر گھر سے چند گھر چھوڑ بیکن ہاؤس سکول میں استاد ہیں۔ پرنسپل مس مرزا دفتر بلا کر بتا رہی تھیں کہ عالمی تحریک ختم نبوت کے رہنما مولانا فقیر محمد کا فون یہ دھمکی دیتے آیا کہ ان دونوں ٹیچرز کو فوراً نوکری سے نکالا جائے ورنہ سکول کے سامنے مظاہرہ اور ٹیچرز کو نقصان ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ مولانا کو تو وہ ٹھنڈا کر چکی تھیں۔ آخر جمیل الدین عالی کی بیٹی ہیں مگر آپ لوگ آتے جاتے دھیان رکھیں۔ یہی مولانا فقیر محمد میری اسی کوٹھی کی تعمیر کے آخری مرحلے میں سوئی گیس کنکشن کا ڈیمانڈ نوٹ جاری ہونے پہ میرے ملازم سیّد اعجاز حسین شاہ کو اپنی دکان کے سامنے گزرتے پائپ فٹنگ کا تخمینہ اور کام دینے کی درخواست کر چکے تھے۔

اور اب دھوئیں کے مرغولوں کی بنی سکرین پر دو کردار اور ابھر آئے تھے۔ سول جج صبح صادق (کاش شب دیجور نام ہوتا) جن کے فراڈ پراپرٹی ڈیلرز، اور فراڈ وکیلوں کے گروہ نے کئی جائیدادیں جعلی ڈگریوں کے ذریعہ منتقل کر ڈالی تھیں اور یکم مارچ ستانوے کو شہزاد ٹاؤن میں اپنے ایک کنال کے پلاٹ پر مکان بنتا دیکھ کر میں "نو مور ان پاکستان" کا نعرہ لگا آیا تھا اور دوسرے لاہور کے وہ "نیک نام" ہول سیل آٹو پارٹس ڈیلر جو ایڈوانس رقم لینے کے باوجود محض دس بارہ ہزار مزید منافع کے لالچ میں مال بھیجنے سے انکاری ہو چکے تھے اور میری خاصی تلخ کلامی پر مجھے سٹور میں بٹھا ایمرجنسی پولیس کو مجھ پر توہین رسالت کے الزام میں دھر کر سواد چکھانے کی دھمکی دے چکے تھے مگر اپنے ملازمین کے سمجھانے پر وہ مجھے چھوڑ اور میں وہ سودا چھوڑ ملک ہی چھوڑنے کے ارادے کو حتمی کر چکا تھا۔ اور تب اواخر اکتوبر سینتالیس میں واہگہ بارڈر کراس کر پاکستان کی حدود میں داخل ہوتے ایک آنے کے چھ ہرے کھٹے سنگترے خرید کر کھاتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے والا چھ سالہ لئیق احمد انیس دسمبر 2001 کی شام سب کچھ اونے پونے بیچ باچ، چھوڑ چھاڑ ایک مرتبہ پھر بیوی بچوں کے ہمراہ مہاجر بنا ٹورونٹو انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر اترتے خدائے ذوالجلال کے حضور شکرانہ ادا کر رہا تھا۔

بیس برس گزر چکے اور آج آگ کے الاؤ کے کونے سے دکھائی دیتا غریب الوطن پاؤں اور ڈنڈے پڑتے ٹوٹتی بھیجا اگلتی کھوپڑی دیکھ کر مجھے قیام پاکستان کے قبل کے انتہائی بچپن میں سنے نعرے۔ پاکستان نہیں پلیدستان، پاکی استھان۔ پ بھی نہیں بننے دیں گے، کافر اعظم، قسم کے نعرے دھاڑتے پاکستان مخالف لیڈروں اسی پاکستان کی گردن پر پنجہ گاڑ چکی نظر آتی ہیں وہیں ایک مرد خدا کے فقرہ "دو تین فیصد (اب تو تناسب شاید دس گنا ہو چکا) شر پسندوں کے ہاتھوں ستانوے فیصد شر فایر غمال ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اویس مظہر کا فقرہ "پہلا واقعہ مت ہونے دو، دوسرا نہیں ہو گا" کی آواز گونجتی ہے۔ تب خیال آتا ہے اگر ترپین کے فرقہ وارانہ فساد کے مجرموں اور سیاسی اغراض کے لئے ان پاکستان دشمن گروہوں کو ہلاشیری کرنے سرکاری فنڈ دینے والے (جسٹس منیر انکوائری رپورٹ) کو قرار واقعی عبرتناک سزا دے دی جاتی تو آج یہ عفریت نفرت کی آگ اگلتے ملک نہ اجاڑ رہا ہوتا۔ اگر تین چار برس قبل ڈیڑھ پونے دو سو سال پرانی یادگار مسجد شیخ حسام الدین سیال کوٹ (میں سکول دور میں یہاں نمازیں ادا کرتا رہا ہوں) کو شہید کرتے ہاتھ روکے جاتے اور نشانۂ عبرت بنا دیے جاتے تو آج مجھے آگ کے الاؤ کے آگے فخریہ سیلفی لیتا درندہ اور الاؤ کے نیچے سے باہر نکلا پاؤں نظر نہ آتا۔ اور بیرون ملک پاکستانی آنکھیں چراتے گردن جھکا چلنے پہ مجبور نہ ہوتے۔

مرے خدایا میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

ڈیلیٹ کی گئی چیزیں کہاں جاتی ہیں؟

بشکریہ روزنامہ الفضل 24نومبر,2021۔از مکرم مدثر ظفر صاحب

جب ہم کوئی چیز اپنے کمپیوٹر یا موبائل میں سے ڈیلیٹ کر دیتے ہیں تو وہ چیز کہاں جاتی ہے؟ کیا وہ کہیں اور سیو ہو جاتی ہے؟ ایک سطر میں اس سوال کا جواب دیا جائے تو یہ ہو گا کہ وہ کہیں نہیں جاتی۔ کمپیوٹر میں محفوظ مواد خواہ وہ تصویر ہو ویڈیو ہو، کوئی ڈاکیومنٹ ہو یا سافٹ ویئر ہو یا کوئی بھی چیز جو آپ اپنے موبائل فون یا کمپیوٹر میں سے ڈیلیٹ کرتے ہیں وہ وہیں موجود رہتی ہے۔ اب اگلا سوال ہو گا کہ اگر وہیں موجود ہوتی ہیں تو ہمیں دوبارہ ان تک رسائی کیوں نہیں ہوتی اور آپریٹنگ سسٹم یہ کیوں بتاتا ہے کہ وہ فائل اب موجود نہیں ہے؟ دراصل جب ہم کوئی بھی چیز اپنے موبائل یا کمپیوٹر میں محفوظ کرتے ہیں تو سسٹم اس چیز کو پوائنٹر کے ذریعے انڈیکس کر دیتا ہے۔ فرض کریں ہم کسی تصویر کو اپنے کمپیوٹر کی سی ڈرائیو میں سیو کرتے ہیں تو ہمارے کمپیوٹر کا آپریٹنگ سسٹم اسے پوائنٹ کرے گا کمپیوٹر کی سی ڈرائیو میں۔ اور جب ہم اس فائل کو ڈیلیٹ کرتے ہیں تو وہ پوائنٹر وہاں سے ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی ڈیلیٹ کی گئی وہ چیز وہیں رہتی ہے لیکن اس چیز تک پہنچانے والا پوائنٹر نہیں رہتا۔ سسٹم ہمیں وہاں تک لے جانے والے پوائنٹر کو ڈیلیٹ کر دیتا ہے اور جب ڈیلیٹ کرنے کے بعد ہم دوبارہ وہاں جاتے ہیں تو وہ چیز ہمیں نظر نہیں آتی۔ اسے مزید آسانی سے یوں سمجھ لیں کہ جب بھی کوئی چیز ہم سیو کرتے ہیں تو گویا وہ ایک رجسٹر پر تمام تفصیلات کے ساتھ میموری میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یعنی رجسٹر میں درج ہے کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے اور کس فارمیٹ میں ہے۔ ہم اس پر کلک کرتے ہیں اور مطلوبہ مواد تک پہنچ جاتے ہیں۔ ڈیلیٹ کرنے پر صرف یہ ہوتا ہے کہ رجسٹر میں درج فہرست میں سے اس چیز کی فہرست ختم ہو جاتی ہے اور جب ہم دوبارہ وہاں دیکھتے ہیں تو سسٹم ہمیں بتاتا ہے کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

تو یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا کہ اگر وہ چیز جو ہم نے ڈیلیٹ کر دی ہے وہیں موجود ہے تو سسٹم جگہ خالی کیوں بتا رہا ہوتا ہے؟ مثلاً ہمارے پاس دو جی بی کا میموری کارڈ تھا اور اس میں دو جی بی کا ہی ڈیٹا موجود تھا اس لیے اسٹوریج ختم ہونے کا بتا رہا تھا اور ہم اس میں مزید کوئی مواد ڈالنے سے قاصر تھے۔ جب ہم نے وہ ڈیٹا ڈیلیٹ کر دیا اب سسٹم دوبارہ دو جی بی جگہ خالی بتا رہا ہے۔ اگر پہلے والا مواد ابھی تک میموری کارڈ میں موجود ہے اور ڈیلیٹ نہیں ہوا تو جو نیا ڈیٹا ہم اس میں ڈالیں گے وہ کیسے اس میں جائے گا؟ تو جواب بہت سادہ ہے کہ وہ بھی وہیں سیو ہو گا اور جیسے جیسے ہم اس میں ڈیٹا ڈالتے جائیں گے وہ پہلے سے موجود ڈیٹا پر اوور رائیٹ Overwrite ہو جائے گا۔

کمپیوٹر اور موبائل میں سیو ہونے والا ڈیٹا Binary Code کی شکل میں ہوتا ہے جسے 10010100100 کے مجموعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ Binary code میں صرف دو عدد ہوتے ہیں صفر اور ایک جن کی ترتیب ہی کسی ڈیٹا کی صورت کو مترشح کرتی ہے۔ یعنی ہر مواد اس کی کوڈ کی صورت میں میموری میں سیو ہوتا ہے جسے ہمارے کمپیوٹر یا موبائل کا آپریٹنگ سسٹم پڑھ کر ہمیں دکھا دیتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے۔ کوئی ڈیوائس جس پر کسی بھی قسم کا ڈیٹا سیو نا کیا گیا ہو وہ بالکل خالی ہو گی۔ جسے 00000000 سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب کمپیوٹر یا موبائل میں ڈیٹا اسٹور کیا جاتا ہے تو وہ 0000000 سے 10010100010 کی صورت میں اسٹور ہوتا ہے۔ ایک بار سیو ہونے کے بعد ڈیٹا کی یہی صورت قائم رہتی ہے اور چاہے ہم اسے ڈلیٹ ہی کیوں نہ کر دیں۔ نیا ڈیٹا ڈالنے کے بعد Binary Code کی شکل مواد کے حساب سے تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ پہلے

سے موجود ڈیٹا پر ہی overwrite ہو جاتا ہے۔ اگر خالی جگہ کو مکمل طور پر نئے ڈیٹا سے اوور رائیٹ نہ کیا گیا ہو تو ڈیلیٹ کرنے اور نیا ڈیٹا ڈالنے کے بعد بھی پہلے سے موجود ڈیٹا نہ صرف موجود ہوتا ہے بلکہ اسے دوبارہ میموری سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔

ڈیٹا ریکوری سافٹ ویئر یہی کام کرتے ہیں۔ وہ پوری میموری کو اسکین کرتے ہیں ڈیلیٹ کی گئی فائل تک پہنچ کر ان فائل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جنہیں ہم ڈیلیٹ کر کے اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔ جیسے کہ ابتداء میں رجسٹر کی مثال دی گئی ہے، ڈیٹا ریکوری سافٹ ویئر اس رجسٹر کو نظر انداز کر کے براہ راست کمپیوٹر، موبائل کی میموری کو اسکین کر کے مطلوبہ مواد تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔ یہاں یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس سارے جھنجٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیوں نہ آپریٹنگ سسٹم کو ایسے ترتیب دیا جائے کہ کوئی فائل ڈیلیٹ کرنے پر وہ کمپیوٹر یا موبائل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ ایسا بالکل ممکن ہے، لیکن ایسا اس لیے نہیں کیا جاتا کیونکہ ڈیٹا تک رسائی دینے والے پوائنٹر کو ختم کرنا پوری فائل کو ختم کرنے کی نسبت بہت آسان اور تیز عمل ہے۔ ڈیلیٹ بٹن دبانے پر سسٹم نے پوائنٹر کو ڈیلیٹ کر کے آپ کو بتا دیا کہ جگہ خالی ہے اس میں ڈیٹا ڈال لیں۔ وہ ڈیٹا ڈیلیٹ کیے گئے ڈیٹا پر اوور رائٹ ہو جائے گا بصورت دیگر مستقل طور پر فائلیں ختم کرنے میں سسٹم کو بہت زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ کسی وائرس کے حملے میں سارا ڈیٹا ڈیلیٹ ہو جائے، یا کوئی ہیکر آپ کا ڈیٹا ڈیلیٹ کر دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود غلطی سے اپنا قیمتی ڈیٹا ڈیلیٹ کر دیں۔ چنانچہ اگر بنیادی طور پر سسٹم ہی ایسا ڈیزائن کیا گیا ہو کہ وہ پہلی بار میں ہی سارے ڈیٹا کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہو تو آپ کے پاس اپنے قیمتی مواد کو دوبارہ حاصل کر پانا ناممکن ہو گا۔ نیز ایسے سافٹ ویئر بھی موجود ہیں جو پہلی بار میں ہی ڈیٹا کو مکمل طور پر ڈیلیٹ کر دیتے ہیں۔ لیکن اسے استعمال کرنا ہر فرد کے لیے ممکن نہیں۔

عام طور پر کمپیوٹر یا موبائل میں اشیاء محفوظ کرنے کے لیے میموری کی دو طرح کی اقسام ہوتی ہیں جو یاداشت محفوظ رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک ہوتی ہے Volatile Memory، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ وقتی طور پر صرف اس وقت متحرک ہوتی ہے جب کمپیوٹر یا موبائل زیر استعمال ہوتا ہے۔ اسے عارضی یاداشت بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کمپیوٹر یا موبائل کو بند کر دیں عارضی یاداشت میں محفوظ معلومات کا ذخیرہ اسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم نے ایک ساتھ کئی کام شروع کر رکھے تھے جیسا کہ کوئی وڈیو چلائی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ورڈ ڈاکیومنٹ پر کوئی کام کر رہے تھے یا کوئی آڈیو سن رہے تھے۔ جیسے ہی کمپیوٹر بند کیا تو وہ کام بھی ساتھ ختم ہو گئے دوبارہ آن کرنے پر وہ ہمیں وہاں نظر نہیں آتے۔ اسی طرح کئی اقسام کے کام ہیں جو صرف کمپیوٹر یا موبائل کی عارضی یاداشت Volatile Memory یعنی Ram ہی کرتی ہے۔ میموری کی دوسری قسم جس میں تمام ڈیٹا سیو ہوتا ہے Auxiliary Memory کہلاتا ہے۔ ریم زیادہ وقت کے لیے ڈیٹا کو محفوظ نہیں رکھ سکتی نہ وہ اس کام کے لیے ڈیزائن کی گئی ہوتی ہے۔ یہ کام Auxiliary Memory کا ہوتا ہے جسے External Memory بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ہم اپنے ڈیٹا کو محفوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی استعمال شدہ موبائل، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر، میموری کارڈ، یو ایس بی سمیت کوئی بھی ایسی ڈیوائس جس میں آپ نے اپنی تصاویر، ویڈیوز یا دستاویزات وغیرہ محفوظ کی ہوں بیچنا مقصود ہو یا کسی کو دیں تو پہلے اس میں سے سارا ڈیٹا ڈیلیٹ کریں۔ اور جتنی اس میں جگہ خالی ہو اس میں اتنا ہی مزید فالتو قسم کا ڈیٹا ڈال کر دوبارہ ڈیلیٹ کر دیں یا اسی میں موجود رہنے دیں۔ آپ کے ہاتھ میں اپنا نجی مواد مکمل طور موبائل یا کمپیوٹر سے ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ موبائل، لیپ ٹاپ یا کمپیوٹر کو مرمت کرواتے وقت بھی ایسا ہی کریں ورنہ بہت زیادہ امکان ہے اس بات کا کہ آپ کا ڈیلیٹ کیا ہوا ڈیٹا نکال کر اسے غلط استعمال کیا جائے۔

جب قوانین عدم مساوات کو فروغ دیتے ہوں: اس کا کیا حل ہے؟

از ابو نائل۔ بشکریہ ہم سب مورخہ 27 نومبر 2021

جب کسی ملک میں عدم برداشت کا راج ہو تو اس تنگ نظری کو قوانین میں داخل کر کے جائز بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب کو مان لینا چاہیے کہ بد قسمتی سے ہم نے پاکستان میں ایک تنگ نظر معاشرہ قائم ہونے دیا ہے۔ اصول تو یہ ہے کہ آئین اور قوانین میں انسانی حقوق کو تحفظ دیا جائے لیکن بد قسمتی سے کئی ممالک ایسے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں جن میں تعصب کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ اور نسل یا عقیدہ کی بنا پر ملک کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور ایک طبقہ کو باقی طبقات پر برتری دلائی جاتی ہے۔ اور آخر کار ایسے قوانین بنتے ہیں جو کہ مظلوم کی بجائے ظالم کی مدد کرتے ہیں۔

اور جب کوئی ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے تو جھٹ یہ فتویٰ صادر کیا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارے آئین اور قانون میں درج ہے۔ اور جو اس کے خلاف آواز اٹھائے وہ ہمارے آئین اور قانون کا غدار ہے۔ اور گردن زدنی ہے۔ پکڑو اور مارو اس غدار کو۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آئین اور قانون انسان بناتے ہیں۔ اگر کسی ملک میں ظالمانہ قوانین بن گئے ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قوانین کو تبدیل کیا جائے نہ کہ جو ان کے خلاف آواز اٹھائے ہاتھوں میں لٹھ پکڑ کر اس کی خوب تواضع کی جائے۔

جب سپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی اور کیتھولک بادشاہ فرڈیننڈ کے دور کا آغاز ہوا تو 31 مارچ 1492 کو ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈیننڈ نے ایک مشترکہ حکم جاری کیا کہ سپین کی حدود میں یہودی مذہب سے وابستہ کسی شخص کو رہنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس قانون کی بنیاد پر زبردستی لاکھوں یہودیوں کا مذہب تبدیل کر کے انہیں عیسائی بنایا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ یہاں پر رکا نہیں۔ کیتھولک حکمرانوں نے مسلمانوں کی خبر لینی شروع کی اور پہلے غرناطہ میں مسلمانوں کے تمام شہری حقوق ختم کر دیے گئے اور 1501 میں یہ اعلان کیا گیا کہ غرناطہ کو مسلمانوں سے پاک کر دیا گیا ہے۔

اور 1502 میں ملکہ ازابیلا نے یہ قانون جاری کیا کہ قشتالہ کی حدود میں اسلام پر پابندی لگائی جاتی ہے اور اس قانون کی بنیاد پر مسلمانوں پر تشدد کر کے انہیں مسیحی عقائد قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جب مسلمانوں سے فراغت ہوئی تو مذہبی عدالتیں بنا کر انکویزیشن کا آغاز کر دیا گیا اور ہاتھ دھو کو مسیحی شہریوں کے پیچھے پڑ گئے اور ہزاروں مسیحی افراد کو زندہ جلا دیا۔ یہ سب مظالم قوانین بنا کر ان کی بنیاد پر کیے جا رہے تھے۔ لیکن کیا یہ قوانین ان مظالم کو جائز ثابت کر دیتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ دوسرا اسبق یہ ہے کہ اگر تنگ نظری کا راستہ پوری قوت سے نہ روکا جائے تو آخر کوئی بھی اس کے نتائج سے محفوظ نہیں رہتا۔

اب نازی جرمنی کی مثال لیتے ہیں۔ ہٹلر نے ایسے قوانین بنائے جس میں نسل پرستی کو تحفظ دیا گیا تھا۔ جس طرح سپین میں مذہب کی بنیاد پر شہریوں کو تقسیم کیا گیا تھا، اسی طرح جرمنی میں نسل کی بنا پر شہریوں کو تقسیم کیا گیا۔ ستمبر 1935 میں یہ قانون منظور کیا گیا کہ صرف جرمن نسل یا اس کی قریبی نسلوں کے افراد ہی اس ملک کے حقیقی شہری بن سکتے ہیں۔ اس طرح یہودیوں اور جپسی نسل کے لوگوں کو بہت سے شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

جرمن خون اور اس کے وقار کی حفاظت کے لئے یہ قانون منظور کیا گیا کہ کوئی جرمن نسل کا شہری، غیر جرمن نسل کے شہریوں سے شادی نہیں کر سکتا اور ان کے درمیان شادی کے بغیر جنسی تعلق بھی غیر قانونی ہو گا۔ یہ قوانین نازی پارلیمنٹ رائسٹاک نے منظور کیے تھے۔ کیا یہ دلیل

قبول کی جاسکتی ہے کہ یہ پارلیمنٹ کا فیصلہ تھا۔ اس لئے یہ ایک جمہوری فیصلہ تھا۔ لہذا اس کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ انسانی عقل یہ بودی دلیل قبول نہیں کی جاسکتی۔

اب ذرا قریب کے زمانے میں جنوبی افریقہ کے نسل پرست نظام کی مثال لیتے ہیں۔ اس دور میں جو بھی مظالم ہو رہے تھے وہ قوانین کی آڑ میں کیے جارہے تھے۔ 1913 میں یہ قانون بنایا گیا کہ زمین کی ملکیت کا فیصلہ بھی چمڑی کا رنگ دیکھ کر ہو گا۔ یہ قانون بنایا گیا کہ سیاہ فام چمڑی کے لوگ صرف 8 فیصد زمین کے مالک ہو سکتے ہیں۔ پھر 1936 میں حاتم کی قبر پر لات مار کر یہ حد 13 فیصد تک بڑھا دی گئی۔ حالانکہ اس ملک کی بھاری اکثریت سیاہ فام تھی۔

1950 میں یہ قانون بنایا گیا کہ تمام شہری اپنے آپ کو رجسٹر کروائیں اور یہ اندراج بھی کروائیں کہ ان کا تعلق کس نسل سے ہے۔ اور 1953 میں یہ قانون بنایا گیا کہ مختلف سہولیات میں مختلف نسل کے لوگوں کا حصہ مخصوص کیا جائے گا۔ اس کا مقصد ان سہولیات میں سفید فام لوگوں کا زیادہ حصہ مخصوص کر کے سیاہ فام شہریوں کی حق تلفی کو قانونی تحفظ دینا تھا۔

شہریوں میں تفریق اور ان پر مظالم کا یہ بھیانک سلسلہ ظالمانہ قوانین کی آڑ میں چلایا جارہا تھا۔ کیا یہ قوانین ان مظالم کا جواز بن سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ آخر کار یہ قوانین ان ممالک اور ان کے نظام کو بھی لے بیٹھے۔ اور آخر کار کیتھولک چرچ کو انکویزیشن پر معافی مانگنی پڑی۔ ہٹلر جرمنی کو کھنڈر بنا کر دنیا سے رخصت ہوا اور جرمنی کو یہودیوں سے معافی مانگنی پڑی۔ اور جنوبی افریقہ کے سفید فام لوگوں کو نیلسن منڈیلا کی صدارت اور شہریوں کی برابری قبول کرنی پڑی۔

پاکستان کے آئین کی شق 2 میں لکھا ہے کہ "اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہو گا۔" سب سے پہلے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مذہب افراد کا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے ضمیر کے مطابق کسی مذہب کو قبول کرتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مملکت کے مذہب کے کیا معنی ہیں؟ قرآن مجید میں بھی ان لوگوں کا ذکر ہے جو کہ ایمان لائے اور ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے انکار کیا۔ کسی حکومت کا کوئی ذکر نہیں جو ایمان لائی ہو۔

اور ہر ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ جب ایک مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا جاتا ہے تو آخر کار اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دوسرے درجہ کے شہری کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح ملک کے شہریوں میں تفریق کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ آئین کی شق 25 میں یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ لیکن جب ایک مذہبی کو مملکتی مذہب قرار دے دیا جاتا ہے۔

تو پھر دوسرے مذاہب سے وابستہ افراد برابر کے شہری نہیں رہ سکتے۔ جس طرح پاکستان میں صدر اور وزیر اعظم کے عہدوں کے لئے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ اگر آئین کے مطابق ہندو اور مسیحی احباب برابر کے شہری ہیں تو پھر وہ ان عہدوں پر فائز کیوں نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ ان عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تو وہ برابر کے شہری کس طرح کہلا سکتے ہیں؟

جب اسمبلی میں 1973 کے آئین پر بحث ہو رہی تھی اور آئین کی یہ شق پیش ہوئی کہ پاکستان میں مملکتی مذہب اسلام ہو گا تو فوری طور پر مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف سے اس کو بنیاد بنا کر ایک کے بعد دوسرا مطالبہ پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مفتی محمود صاحب نے 5 مارچ 1973 کو یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ سرکاری مذہب اسلام ہے اس لئے آئین میں یہ درج ہونا چاہیے کہ کوئی چیف جسٹس، کسی مسلح فوج کا سربراہ بلکہ کسی بھی کلیدی عہدے پر کوئی غیر مسلم مقرر نہیں ہو سکتا۔ 9 مارچ کو مولوی صدر الشہید صاحب نے یہ مطالبہ

پیش کیا کہ آئین میں اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ مذہبی ماہرین کے تشخیص کردہ اسلامی اصول و فروع کا تحفظ بقا اور اشاعت مملکت کا اولین فریضہ ہو گا۔ شہریوں کی طرز زندگی اور حکومت کا نظم و نسق اسلامی احکام کے تحت لازما ہو گا۔

گویا مملکت ان کے مذہبی ماہرین کی کوئی غلام ہو گی اور ہر شہری کو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اسے اسلامی طرز زندگی اپنانی ہو گی۔ اور 14 مارچ کو غلام غوث صاحب نے یہ ترمیم پیش کر دی جو شخص کسی آیت کریمہ یا کسی مسلسل حدیث نبوی ﷺ کی مقبول عام توضیح یعنی تشریح کو بھی ماننے سے انکار کرے اسے بھی مرتد اور غیر مسلم قرار دے دینا چاہیے۔ ان کے ذہن نارسا میں یہ نکتہ نہیں آیا کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سی تشریح مقبول عام توضیح کہلانے کی مستحق ہے۔

اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان وزیر اعظم یا صدر ان حضرات کی تشریح کو بھی تسلیم نہیں کرے گا وہ اپنے عہدے سے محروم کر دیا جائے گا کیونکہ وہ اب مرتد ہو گیا ہے۔ یہ ترامیم منظور نہیں ہوئیں لیکن اس ذہنیت کے کے کیا نتائج بر آمد ہو سکتے ان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تعصب کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر پاکستان میں عدم رواداری کی فضا ختم کرنی ہے تو سب سے پہلے آئینی طریق کے مطابق ملک کے قوانین میں حقیقی مساوات پیدا کرنی ہو گی۔ اگر بنیاد ہی درست نہیں ہو گی تو اس پر تعمیر عمارت کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ اگر پاکستان کے آئین میں یہ لکھا ہوا ہے کہ تمام شہری برابر ہیں تو سب سے پہلے ملک کے قوانین میں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔۔

"دنیا کا کوئی ملک نہیں جہاں رات سونے سے پہلے چشم تصور میں مَیں نہ پہنچتا ہوں اور ان کے لئے سوتے وقت بھی اور جاگتے وقت بھی دعا نہ ہو۔ یہ مَیں باتیں اس لئے نہیں بتا رہا کہ کوئی احسان ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ اس سے بڑھ کر مَیں فرض ادا کرنے والا بنوں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ خلافت اور دنیاوی لیڈروں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا"۔ خطبہ جمعہ 6/ جون 2014

صدق سے میری طرف آؤ اسی میں خیر ہے
ہیں درندے ہر طرف میں عافیت کا ہوں حصار

اسلامی نظام کی مخالفت لبرل سے زیادہ مولوی کریں گے

15/11/2021 عدنان خان کاکڑ ۔ بشکریہ ہم سب

مختلف مولوی حضرات اور عام افراد کا بیان تو آپ نے بارہا سنا ہی ہو گا کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ مگر کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا سب سے زیادہ نقصان کسے پہنچے گا اور کون اس کی سب سے زیادہ مخالفت کرے گا؟

لبرل طبقے کو اس کا کوئی خاص نقصان نہیں پہنچے گا۔ لبرل پارٹیاں تو قدامت پرست سعودی عرب میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہاں آزادی اظہار کا حق چھننے کا انہیں کچھ غم ہو گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ پاکستان میں آزادی اظہار کا حق پہلے ہی چھینا نہیں جا چکا؟ تو مزید کیا فرق پڑے گا؟ لبرل تو ابھی بھی "اسلامی جمہوریہ پاکستان" پر صبر شکر کیے بیٹھے ہیں۔ مگر پاکستان سچ مچ ایک اسلامی مملکت بن گیا تو کیا ہو گا؟

ملک میں کسی آمر یا پارلیمان نے اسلامی نظام نافذ کر دیا تو اس کی لبرلوں سے زیادہ مخالفت مولوی کریں گے۔ مختلف مسالک کے مولویوں کی رنگ رنگ کی مساجد ختم ہو جائیں گی۔ مسجد اسلامی حکومت کی ملکیت ہوتی ہے اس لیے ہر کسی کو اپنی یا قبضے کی جگہ پر مسجد بنانے اور چلانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ خطبہ امام کا نہیں حکمران کا ہوتا ہے۔ یعنی عمران خان، آصف زرداری، نواز شریف یا جنرل صاحب جو خطبہ دیں گے امام کو منبر سے وہی پڑھنا ہو گا۔ امام اپنی مرضی سے خطبہ دے گا تو سیدھا جیل جائے گا۔

مسجد چلانا حکومت کی ذمہ داری ہو گا۔ یعنی چندے کا سسٹم بند۔ اور امام خطیب وغیرہ حکومتی لائسنس یا ملازمت کی بنیاد پر چلیں گے۔ رنگ رنگ کی مذہبی جماعتیں ختم ہو جائیں گی۔ حکمران کا جو مسلک ہو گا صرف وہی قبول ہو گا، باقی خلاف اسلام قرار پائیں گے اور بدعتی قرار پا کر سزا پائیں گے۔ اور یوں مذہب کی بنیاد پر لیڈری چلانے کی گنجائش نہیں ہو گی۔

مدارس بھی اپنی مرضی سے چلانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ان کے نصاب اور نظام کا تعین اسلامی حکمران کرے گا۔ ان کی نگرانی حکمران کرے گا۔ اور وہ وہی دینی تعلیم دیں گے جو حکمران طے کرے گا۔ یوں مدارس کے نام پر دولت کمانے کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔

حضرت عمرؓ جیسے حکمران کی بات تو رہنے دیتے ہیں کہ وہ مقدس دور تو لوٹ کر نہیں آئے گا، حکمران آج کے سعودی یا ایرانی حاکموں جیسا بھی ہوا تو مذہبی معاملات میں عام لوگوں کیا بڑے بڑے علما کو بھی اپنی اطاعت پر مجبور کرے گا۔ ممکن ہے کہ ان سے رائے لے لے لیکن کرے گا وہی جو خود اسے درست لگے گا۔ اور جو اس کے فیصلے کو نہیں مانے گا وہ درے کھائے گا یا جیل جائے گا۔

جدید دور میں اس کی مثال دیکھنی ہو تو سعودی عرب، ایران اور متحدہ عرب امارات میں دیکھ لیں کہ کیسے حکمران کی مخالفت کرنے والا مولوی جیل میں جاتا ہے۔ اور وہاں نہ مذہبی جماعتیں ہیں نہ عام افراد یا نجی اداروں کی جرات ہے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا سکیں۔ یا بہت ہی زیادہ عبرت پکڑنی ہو تو طالبان یا داعش کی حکومت یاد کر لیں۔

اگر ایسا نظام آجائے جس میں مولوی کو اپنی حکومت قائم کرنے یا کاروبار کرنے کا موقع نہ ملے، وہ زیادہ سے زیادہ حکومت کا ملازم ہو کر، یا ترکی کے انداز میں حکومت سے لائسنس لے کر ہی امامت کرے یا خطبہ دے، تو وہ ایسے نظام کی مخالفت کرے گا یا حمایت؟

اور پھر یہ اسلامی حکمران مخالف مسلک کا ہوا تو اس کا رائج کردہ نظام بھی ان مولانا حضرات کی نظر میں کفر یا کم از کم بدعت پر مبنی ہو گا کیونکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کو ہمارے مولوی صاحبان کافر یا بہت رعایت کر کے بدعتی ہی کہتے ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کو کیا مٹھی بھر لبرل روکے ہوئے ہیں یا وہ چورانوے فیصد عوام یا بے شمار مولانا حضرات جو اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں؟ امریکی ادارہ پیو ریسرچ سینٹر کے 2016 کے سروے کے مطابق 78 فیصد پاکستانیوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ پاکستان ملک میں قرآنی تعلیمات کے مطابق بنائے گئے قوانین کا مکمل طور پر اطلاق چاہتے ہیں۔ سولہ فیصد کچھ نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے اسلامی قوانین کے نفاذ کے خواہاں ہیں۔ جبکہ صرف دو فیصد ایسے افراد ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے قوانین کو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہونا چاہیے۔

باقی حساب آپ خود جوڑ لیں کہ ان چورانوے فیصد کی مرضی کے خلاف کیا واقعی دو فیصد لوگ اپنی مرضی کے قوانین بنا سکتے ہیں؟ یا پھر ان چورانوے فیصد کے مذہبی لیڈران دو فیصد کے ہم خیال ہیں۔ ہاں مولوی حضرات کو خود حکمرانی مل جائے تو مطلق العنان حکمرانی پا کر وہ شوق سے یہ نفاذ کریں گے اور دوسرے مسالک کی بیخ کنی کریں گے۔

(نوٹ از ناقل: مضمون مندرجہ بالا میں پیش کردہ حقائق کی تصدیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ 1977 سے لے کر 1988 تک، محترم ضیا الحق صاحب کے دور حکومت میں اسلامی کہلانے والی جماعتوں کو مکمل حکومتی پشت پناہی / سرپرستی میسّر تھی۔ اس دور میں اگر ان کے پاس کوئی ان کو قابلِ قبول فارمولہ ہوتا تو یہ نام نہاد اسلامی نظام کو نافذ کروا سکتے تھے لیکن یہ "طبقہ" اتنا بھولا بھی ہرگز نہیں کہ اپنی بقاء کو ہی اسلامی نظام کے نفاذ کے ذریعہ داؤ پر لگا دے۔)

نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے
واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں

آواز دوست

سائنس میگزین۔ایڈیٹر

جناب قاسم محمود کی نظر کا مبہوت کُن واقعہ

تحریر:بشیر الدین احمد سامی (مرحوم) بشکریہ الفضل 2نومبر,2021

ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو حضرت اباجی سردار مصباح الدین صاحب کے ساتھ جو عقیدت تھی اس کی ایک جھلک اس مبہوت کُن واقعہ میں نظر آتی ہے جس کا ذکر پاکستان کے رسالہ ”سائنس میگزین“ کے معروف ایڈیٹر جناب قاسم محمود صاحب نے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی سائنس کے میدان میں خدمات اور کارہائے نمایاں پر اپنے خطاب میں کیا۔ یہ واقعہ فلم بند بھی ہوا اور مسلم احمدیہ ٹیلیویژن پر دکھایا گیا۔

جناب قاسم صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”ڈاکٹر صاحب کا لاہور سے فون آیا کہ آپ میری ہمشیرہ کے گھر پہنچ جائیں۔ پتہ آپ اُن سے خود پوچھ لیں۔ گلیوں میں مکان تھا جس کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ کچھ مشتاق حضرات ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے، بیٹھک کہنا چاہئے جو ہمارے متوسط طبقہ میں ہوا کرتا ہے۔ دیواروں پر قرآن کریم کے خوبصورت طغرے آویزاں تھے۔ لیجئے! ڈاکٹر صاحب کی سواری آگئی لیکن وہ بیٹھک میں نہیں آئے جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے۔

اُنہیں چپکے سے ساتھ والے بغلی کمرے میں لے جایا گیا۔ دونوں کمروں کے درمیان کواڑ تھے اور بند تھے۔ پھر بھی ایک تھوڑی سی جِھرّی رہ گئی تھی۔ خواہ مخواہ میری نظریں اس طرف کو جمی ہوئی تھیں۔ ایک اُونچی سی کرسی پر ایک بُت رکھا ہوا تھا۔ سر پر پگڑی ،لمبی سفید داڑھی۔ میں نے سمجھا کہ یہ بُت مرزا صاحب کا ہی ہو سکتا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب جُھک کر اَوتار کی قدم بوسی کر رہے ہیں۔ کسی نے کواڑ بند کر دیا اور میں خفیف سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جو خیالات میں ڈاکٹر صاحب کے لئے رکھتا تھا وہ بت پرستی سے بُری طرح متزلزل ہو گئے گویا دنیا ہی بدل گئی۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ہمشیرہ، بھانجی، بھانجیوں سے مل کر بیٹھک میں آئے۔ اُن کی مہربانی انہوں نے سب سے پہلے مجھے ہی قریب بلایا اگرچہ میں اندر سے گُھلا (کھولا) ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اجازت لی اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ میں نے وہ رات کانٹوں پر بسر کی۔ کتنا عظیم انسان جو بات بات پر قرآنِ کریم کے حوالے دیتا ہے۔ بُت پرست ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہ آئے۔ دوسرے دن مجھ سے رہا نہ گیا، اور میں نے اُن کی ہمشیرہ کو فون کیا، اور وہ بہت خوشی سے پیش آئیں۔ وہ

بہت خوش تھیں کہ ان کے بھائی جان نے غریب نوازی کی تھی اور عرصہ دراز کے بعد ان کے گھر آئے تھے ورنہ پہلے باہر ہی ہوٹلوں میں ٹھہر کر چلے جاتے تھے۔ کہنے لگیں کہ میرا بھائی بہت خوش خوراک ہے میں نے اُن کی پسند کی تین ڈشیں بنائی تھیں لیکن آپ بہت جلدی چلے گئے۔

میں نے جسارت کر لی کہ بتائیں ہمارے کمرہ میں آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب بغلی کمرہ میں کس کے پاس گئے تھے؟ کہنے لگیں یہ ایک بہت ہی ذاتی سی بات ہے سختی سے منع کر رکھا ہے مگر آپ نے پوچھا ہے تو بتا دیتی ہوں۔ یہ اُن کے اسکول کے زمانے کے آخری اُستاد ہیں جو بقیدِ حیات ہیں 80 یا 85 سال کے تو ہونگے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ کیا بتاؤں بھائی جان اپنے اُستادوں کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ بھائی جان کو انہوں نے چھوٹی کلاسوں میں پڑھایا ہے۔ پتہ نہیں فارسی، عربی، تاریخ یا جغرافیہ پڑھایا ہے۔ مجھے معلوم نہیں پہلے وہ چنیوٹ ضلع جھنگ میں رہتے تھے جب مصروفیت اجازت دیتی تھی ڈاکٹر صاحب ان سے ملنے چنیوٹ چلے جاتے تھے۔ پھر مصروفیت زیادہ بڑھیں تو اُنہیں کراچی بلوا لیا ہے اور کورنگی میں ایک کوارٹر لے دیا ہے۔ حسبِ توفیق خدمت کرتے رہتے ہیں اپنے استاد کی قدم بوسی کے لئے وہ خود کراچی آتے جاتے ہیں۔ ان کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ لیکن کل صبح بھائی جان نے لاہور سے ٹیلیفون کیا تھا کہ ماسٹر صاحب کو کورنگی سے ایسی گاڑی بھجوا کر بلوا لوں جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس لئے ہم نے گاڑی بھجوا کر انہیں بلوا لیا وہ بس پانچ منٹ میں واپس چلے گئے تھے۔ میں کیا بتاؤں میرا بھائی فرشتہ ہے فرشتہ"!!

جناب قاسم محمود صاحب نے جب اپنا مبہوت کُن واقعہ ختم کیا تو سامعین نے بھرپور تالیوں سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت اور سعادت مندی کی جی بھر کر داد دی۔ اس جاندار واقعہ کے سفید پگڑی اور سفید لمبی داڑھی والے مرکزی کردار محترم سردار مصباح الدین صاحب تھے جن کا ڈاکٹر صاحب بے حد احترام کرتے تھے۔

یہاں اس بات کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جناب قاسم محمود صاحب کی نظروں نے ایسا دھوکہ کیوں کھایا جس سے ان کے خیالات ڈاکٹر صاحب کے لئے متزلزل ہوئے۔ امر واقعہ یہ تھا کہ حضرت سردار صاحب کے کولھے کی ہڈی اس بُری طرح ٹوٹ چکی تھی کہ باوجود آپریشن کے وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ وہیل چیئر استعمال کرنے لگے تھے۔ ادھر کان کی شنوائی بھی بُری طرح متاثر تھی جس کی وجہ سے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہی بات ہو سکتی تھی اور وہ بھی بہت مشکل کے ساتھ۔ ان کی وہیل چیئر اونچی سطح کی تھی وہ ہمیشہ سفید پگڑی پہنتے تھے، سفید داڑھی اور سفید قمیص شلوار۔ ڈاکٹر صاحب جو انتہائی مصروفیت کے عالم میں تھے اور کسی اگلی ہی فلائٹ سے واپس جانے والے تھے ان کی سعادت مندی کی انتہا تھی کہ انہوں نے اپنے اس بزرگ کو پہلے ملنا پسند فرمایا تا کہ چند ساعت ہی سہی وہ ان سے مل سکیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُن کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔ جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو یقیناً جھکنا پڑا اور خیریت معلوم کرنے اور دعا کا کہنے کے لئے کانوں کے قریب ہونا پڑا۔ یہ وہ نظارہ تھا جس کو ایک اجنبی ایک چھوٹی سی جھرّی میں سے دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ گیا۔ بزرگوں کا احترام دراصل ڈاکٹر صاحب کی گھٹی میں ہی تھا۔

بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے
nsatz für Arbeit:
rbeit sichern in der Wir
t Olaf Scholz

بُرا جو دیکھن میَں چلا بُرا نہ ملیا کوئے

جو من کھوجا اپنا تو مجھ سے بُرا نہ کوئے

سُفنے دے وچ ملیا ماہی تے میں گل وچ پا لَیّاں باہنواں

ڈَردی ماری اَکھ نہ کھولاں کتے فیر وچھڑ نہ جاواں

انسان کے پاس خوش رہنے کے ہزاروں جواز ہوتے ہیں

مگر وہ ایک اُداسی کی ضرب سے ان سب کو قتل کر دیتا ہے

ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواجِ یزید

دین حق بیمار و بے کس ہمچو زین العابدین

بارود بھرے لوگ

قارئین کرام برادرم مکرم جمیل احمد صاحب کا ذیل میں دیا گیا مضمون روزنامہ الفضل مورخہ 17 دسمبر 2021 سے لیا گیا ہے۔ جس میں پاکستان میں ہونے والے ایک واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرکے بڑی دلسوزی سے راہ نجات دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دِلدوز واقعات پاکستان کا آئے دن کا معمول بن چکا ہے جبکہ ارباب حل و عقد کسی پائیدار حل کی طرف راغب نہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بصیرت عطا فرمائے، ملک پاکستان میں امن و امان کی فضا پیدا ہو اور ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو۔ آمین (ادارہ)

3 دسمبر کو سیالکوٹ میں ایک انسانی جان کا جس ظلم و بربریت سے زیاں کیا گیا ہے۔ اس سے مذہب کے نام پر خون بہانے کی ملکی تاریخ میں ایک اور سیاہ باب کا افسوسناک اضافہ ہوا ہے۔

جیسے بارودی سرنگیں

مشتعل ہو کر کئی سو افراد کا ایک نہتے فرد پر یوں حملہ آور ہونا اور کسی کا اسے روکنے کی کوشش نہ کرنا اس غیض و غضب کا مظہر ہے جس نے عوام الناس کے دلوں کو کئی دہائیوں سے دی جانے والی نفرت، عدم رواداری، عدم برداشت کی مسلسل تعلیم، روّیوں اور حمایت نے بھر رکھا ہے۔ بارود بھرے ان لوگوں کو پھٹنے کے لئے کوئی بھی بہانہ کافی ہوتا ہے۔ جیسے وہ بارودی سرنگیں جو دشمن کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بچھائی جاتی ہیں اور نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود، وجود رکھتی ہیں اور کسی ٹھوکر پر پھٹ کر نقصان کر گزرتی ہیں۔

تحت الثریٰ کی طرف

اس دین سے تعلق کے دعوے کے ساتھ جس نے ایک انسان کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا اور جس نے حوصلہ، برداشت اور رواداری کی بے مثل تعلیم دی، اور اس عظیم ترین وجود صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے اور جنہوں نے خود مذہبی رواداری اور برداشت کا حیرت انگیز اسوہ دکھایا حتیٰ کہ غیر مذاہب کے جنازوں کا احترام بھی عملاً کرکے دکھایا۔ آج گرتے گرتے گویا تحت الثریٰ کو پہنچ جانا ایک عبرتناک تاریخ ہے۔

آگ کا عذاب

قرآن کریم میں 145 مقامات پر نار کا ذکر ہے جن میں سے بیشتر جہنم کے حوالے سے ہیں۔ یہ معاملہ تو خیر بعد کا ہے۔ لیکن اپنے وجودوں میں بارود بھرے لوگ جو یہاں بھی ہر دم اپنے آپ کو غیض و غضب کی آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ کیا وہ اسی دنیا میں عذابِ جہنم سے حصہ تو نہیں پا رہے؟ یہ مقامِ خوف ہے اور اسی لئے مقامِ فکر۔

ذمہ داریاں

اس انجام تک پہنچانے میں دین سکھانے والے، حکومت کرنے والے، قانون بنانے والے، فیصلے کرنے والے، میڈیا والے، خاموش رہ کر تماشا دیکھنے والے، اور خود عقل و خرد کو تج کر ان مفاد پرست ٹولوں کے ہاتھوں کھلونا بننے والے سب یکساں ذمہ دار ہیں۔ ان سب نے اپنے طور بھی

اور ایک دوسرے کی مدد کر کے بھی اس زوال میں حصہ ڈالا ہے۔

پہلے ذمہ دار: مولوی

جیسا کہ پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا کہ بعض دین سکھانے والے انسانی سطح سے پست ہو جائیں گے۔ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اور اس گروہ نے اپنی اپنی جتھہ بندی اور اس کے تحت دنیا کمانے کے لئے دوسرے عقیدے والوں کے خلاف نفرت اور عدم برداشت کی تعلیم دی اور دے رہے ہیں۔ اکٹھے عبادت نہ کرنے اور سماجی تعلقات نہ رکھنے کی ابتدا نے واجب القتل کے فتووں تک پہنچایا اور اب "سر تن سے جدا" کا نعرہ دیا۔ مستشرقین کے طریق پر چلتے ہوئے غیر مستند روایات کے سہارے، محض اپنی اذیت پسندی کی تسکین کے لئے، خون ریزی کا یہ درس دین کی امن و سلامتی کی ضامن تعلیم کے صریحاً برعکس ہے۔

دوسرے ذمہ دار: حکومتیں

وہ سب حکومتیں جن کا حصول اقتدار یا اس کے جاری رکھنے کے لئے مذہب کا استعمال وطیرہ رہا ہے۔ وہ جنہوں نے اس غرض سے مقنّنہ کو استعمال آئین میں دوسری ترمیم کی۔ اور وہ جنہوں نے اس کے تابع بعد میں مزید ایسے قوانین بنائے جنہوں نے نفرت انگیزی اور تعصب کے ان شعلوں کو اور بھی ہوا دی۔ جنہوں نے اسی غرض سے مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے علماء کی سرپرستی کی۔ بلکہ از خود بھی مفید طلب مذہبی گروہ بنائے، ان کی معاونت کی، ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کئے رکھا اور حسبِ ضرورت انہیں استعمال کیا۔ جس کے ایک بد نتیجہ میں ملک لمبے عرصہ تک بھیانک دہشت گردی کا شکار رہا ہے۔ یہ سرپرستانہ رویہ مجموعی طور پر نفرت انگیزی کی مہم کے پھیلاؤ کا سبب اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومتی اداروں اور موثر کاروائی میں سب سے بڑی روک ہے۔

تیسرے ذمہ دار: مقنّنہ

وہ سب اسمبلیاں جن کے ارکان گو بعد میں وائٹ پیپر اور احتسابی عمل کے کردار رہے ہیں لیکن جنہوں نے اپنے دنیوی مفاد کی خاطر وقت کے حکام کے اشاروں پر اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ایسی قانون سازی کی جو ایک طرف دینی تعلیم کے سراسر برعکس اور مروجہ بین الاقوامی اصولوں سے متصادم تھی وہیں اس نے مذہبی منافرت کو قانون کا درجہ دے دیا۔ اور جنہوں نے ایسے قوانین بنائے جانے کو نہ روکا جن کے تحت پورے ملک میں سے صرف ایک جماعت کی علیحدہ ووٹر لسٹ بنائی جاتی ہے اور بیشتر سرکاری دستاویزات جیسے شناختی کارڈ فارم، پاسپورٹ فارم، پاسپورٹ، تعلیمی میں اداروں کے داخلہ فارم، اعلیٰ ملازمتوں کے لئے درخواست فارم، ووٹر لسٹ اور اب نکاح ناموں میں بلا ضرورت مذہب کا خانہ شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ ان سب کا مقصد کھلے طور پر صرف تفریق اور نفرت کا کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنا اور آبادی کے ایک حصہ کا استحصال ہے۔

چوتھے ذمہ دار: عدلیہ

وہ سب جو انصاف کی کرسی پر بیٹھے تھے لیکن جنہوں نے انصاف اور قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے ان تفریقی قوانین کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ حسب استطاعت ان میں ویسی ہی ایزادیاں بھی تجویز کیں۔ پھر وہ جنہوں نے نفرت انگیز جرائم کرنے والوں کی نہ صرف گرفت نہیں کی بلکہ انہیں آزاد بھی کیا۔ اور وہ بھی جنہوں نے نہ کردہ جرائم کی پاداش میں گرفتاروں کی دادرسی نہ کی اور بسا اوقات ضمانت تک نہ لی۔ اور وہ بھی جنہوں نے ان قوانین کے بے جا استعمال سے کی جانے والی حق تلفیوں کو روا رکھا یا ایسے مقدمات کی ارادتاً شنوائی نہ کی۔ اور یوں ان سب نفرت کا پرچار کرنے والے قانون شکنوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کیا تعجب ہے کہ پاکستان کی عدلیہ دنیا بھر کے عدالتی نظاموں میں درجۂ آخر پر شمار ہوتی ہے

پانچویں ذمہ دار: میڈیا

چند مستثنیات کو چھوڑ کر وہ سب پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا جس نے نفرت انگیزی کی مہم میں جھوٹ بول کر یا معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کر غلط رنگ دیا اور دوسری طرف اس مہم کے شکار چھوٹی جماعتوں کے خلاف ظلم وزیادتی کے واقعات سے عمداً آنکھیں بند کئے رکھیں اور ان خبروں کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ حتی کہ ان کی جاری کردہ پریس ریلیز کو بھی شائع نہ کیا اور یوں عملاً اس مہم کے موئید و مددگار بنے رہے۔ نیز وہ سب میڈیا جس نے اس نفرت انگیزی کی مہم کے توڑ کے لئے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی میں عوام کو باہم محبت اور بھائی چارہ کا درس نہ دیا دیا اور تنگ نظری سے عقیدہ کی بنیاد پر تفریق کرنے اور نفرت پھیلانے کی مذمت نہ کی۔

چھٹے ذمہ دار: خاموش تماشائی

ملک کے شرفا کی وہ بھاری اکثریت جس نے بزدلی سے منافقت کی راہ اپنائے رکھی۔ جنہوں نے نجی محفلوں اور ڈرائنگ روم مجالس میں انسانی حقوق اور بھائی چارے کی خوب وکالت کی لیکن بھر زبان بند رکھی۔ وہ ان غلط کاریوں میں براہ راست عملاً شریک تو نہ ہوئے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھائی نہ مخالف رد عمل ظاہر کیا اور یوں ان کی خاموش حمایت کی۔ اور اس غلط تاثر کو ہوا دی کہ گویا سارا ملک ہی نفرت انگیزی کی اس مہم میں شریک ہے۔

ساتویں ذمہ دار: عوام الناس

وہ سب عام لوگ جو کالانعام بنے رہے۔ جنہوں نے مخالف پروپیگنڈا کو صرف سن کر سچ مان لیا۔ ان کے عقیدے کے صحیح یا غلط ہونے کو جانچا نہ ان کے خلاف سنی سنائی باتوں کو پرکھا۔ اور نہ اس مشاہدہ کو مقدم کیا جو دوسرے عقیدے والوں کے پڑوس میں رہ کر، ساتھ کھیل کر، بچپن سے ساتھ بڑے ہو کر، اسکول اور کالج میں اکٹھے تعلیم پاکر، ملازمتوں اور کاروبار میں اکٹھے وقت گزار، کر رشتے داریاں رکھ کر وہ حاصل کر چکے تھے۔ غرض اپنی عقل کو استعمال نہیں کیا۔ اور آنکھیں بند کر کے روحانی نابیناؤں کے پیچھے چلتے رہے۔ اور جب مولوی نے جو کہا اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ سلام دعا ترک کر دی، میل ملاقات چھوڑ دی، لین اور کاروبار میں الگ کر دیا۔ اور اس بات کو بھول گئے کہ اس حوالے سے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا اسوہ تھا۔

پستی سے نکلنے کی راہ

اس پستی سے نجات کی راہ صرف غلطیوں کی درستگی ہے۔ اس میں کلیدی کردار حکومت کا ہے۔ اسے جہاں خود کو مذہب سے علیحدہ کر کے اپنے ان بنیادی فرائض کو ادا کرنا ہو گا کہ بلا کسی تفریق کے اس کی رٹ قائم ہو۔ بلا استثنا سب فسادی کیفر کردار تک پہنچیں۔ حکومتی مناصب صرف صلاحیت کی بنا پر تفویض ہو۔ ہر شہری کو بلا لحاظ مذہب وعقیدہ اس کے جملہ حقوق حاصل ہوں۔ وہیں اسے یہ بھی یقینی بنانا ہو گا کہ اسمبلیاں ان سب قوانین کو قلم زد کریں جو مسلمہ بنیادی انسانی حقوق کی نفی کرتے ہیں۔ یا جو ملک کے شہریوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ عدالتیں بلا لحاظ عقیدہ سب کو جلد انصاف مہیا کریں اور میڈیا صحافتی اصولوں کے تابع بلا لگی لپٹی اور بلا تفریق آگاہی دے۔

حکومتی سطح پر مثبت پیش رفت شہریوں کے لیے بھی درست راہ متعین کرے گی اور رفتہ رفتہ ان میں اختلاف عقیدہ کی برداشت کا حوصلہ اور گفتگو سے معاملات کے حل کا رجحان پیدا ہو گا۔ اور نفرتیں دور ہوں گی۔

یہ کام جتنی جلد ہو گا موجودہ اندھیرا اتنی جلد دور ہو گا۔

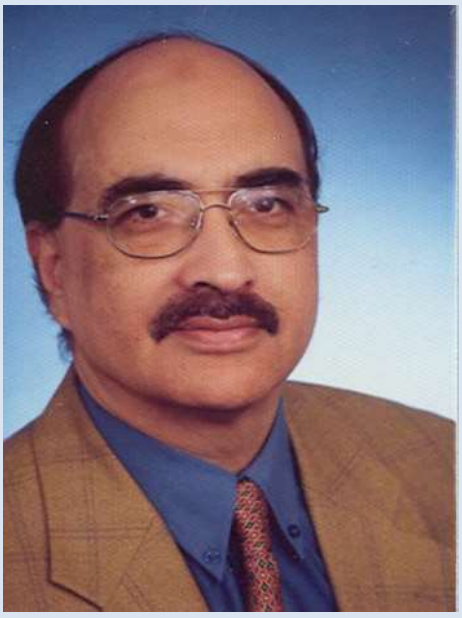

سابق صدر صاحبان

ٹکوساجرمنی

دائیں جانب

مکرم عرفان احمد خاں صاحب

بائیں جانب

مکرم نعیم احمد طاہرؔ صاحب

کیا فائدہ علاج کا بعد از فنا مجھے
اے کاش! دردِ دِل کی ملے اب دوا مجھے

اہلِ جَفا کے ظُلم سے اتنا ہوا ہوں تنگ
دوزخ کا اس جہان پر دھوکا ہوا مجھے

عِصیاں کی مَے کو پی کے ہوئی کیا نہ بیخودی
بھولا ہے کہہ کے یار سے قولِ بلیٰ مجھے

لے چل صبا! تو دوست کے در پر کہ کر دیا
اس آسیائے چرخ نے اب سرمہ سا مجھے

کرتارپور راہداری اور مذہبی سیاست گری

(بشکریہ روزنامہ 92۔ بدھ 06 نومبر 2019ء۔ از جناب اوریا مقبول جان صاحب)

(نوٹ از ایڈیٹر: مکرم اوریا مقبول جان صاحب پاکستان کے ایک مذہبی جوشیلے، سابق لامذہب اور سابق بیوروکریٹ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کئی خوبیوں سے نوازا ہے۔ انکی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں بھی عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ ذیل میں ان کا مضمون دیا جارہا ہے جس پر عنوانات اپنی طرف سے لگائے گئے ہیں۔ آخر پر قاری سمجھ سکتا ہے کہ موصوف جس کا دل گواہی دیتا ہے مگر وہ نُور سے فراری ہے۔ بریکٹس میں ان کا اصل مضمون من وعن ہے)

احتیاط نمبر 1: تفصیلی ابتدائیہ جس میں اپنے موقف "مذہبی سیاست گردی" کو بیان کرتے ہوئے مولوی کے خوف سے اپنے آپ کو سکہ بند مسلمان ثابت کرنے کے لئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"آج سے تقریباً تین سال قبل میں آخری دفعہ بھارت یونیسکو کی ایک **میٹنگ میں شرکت کے لیے گیا، تو میں نے دِلی براستہ سڑک جانے کا قصد کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں امرتسر کی مرکزی مسجد خیر الدین کے صحن میں مدفون اپنے دادا اور دادی کی قبر پر حاضری دینا چاہتا تھا۔** میرے دادا مولوی خدا بخش مرحوم اپنے مرشد کے حکم پر تقریباً دو صدیاں پہلے سیالکوٹ میں امام علی الحق کے مزار کے ملحقہ علاقے سے ہجرت کرکے برطانوی ہندوستان کے ضلع ہوشیار پور کے قصبے میکریاں میں جاکر آباد ہوئے۔ ان کے دادا حکیم شرف الدین عباسی سیالکوٹی مشہور حکیم تھے۔ رنجیت سنگھ کی بیوی رانی جنداں کو جلد کی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ ٹھیک نہ ہوتی تھی۔ حکیم صاحب کی دوا سے ٹھیک ہوئی تو رنجیت سنگھ کا گھرانہ معتقد ہو گیا۔ جب داد اور ان کے والد خلیفہ کریم بخش نے میکریاں ہجرت کی تو رنجیت سنگھ نے وہاں کئی مربع زمین ان کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے وہاں مسجد بنائی اور دین کی تعلیم کا آغاز کیا۔ اسی میکریاں کے سکھ گھرانے کے ہاں ایک لڑکا حاکم سنگھ پیدا ہوا۔ جوان ہوا تو مولوی خدا بخش کی محبت نے اسے اسلام کی حقانیت کی طرف مائل کیا۔ اسلام قبول کیا تو نام منشی حاکم علی اور پھر مولوی حاکم علی رکھ لیا۔ سکھ مذہب چھوڑا اور میرے دادا کے پاس میکریاں کی مسجد میں قرآن پڑھنے لگ گیا۔ یہ وہی مولوی حاکم علی ہیں جو علامہ اقبال کے ساتھیوں میں سے تھے اور جنہوں نے اسلامیہ کالج سول لائنز کی بنیاد رکھی اور اس کے پرنسپل بھی رہے۔ دادا کو حکم ہوا کہ یہ زمین جائیداد چھوڑو اور امرتسر میں جاکر مسجد بناؤ اور سنبھالو۔ میکریاں میں آموں کے باغوں کو متاع غرور (دھوکے کا سامان) سمجھ کر ایک نگاہ ڈالی اور امرتسر آگئے۔ مسجد خیر الدین میں دین کی تعلیم کا آغاز کیا۔ اور ساتھ ہی 1883ء میں مسجد خیر الدین کے اندر ہی مدرسہ المسلمین کے نام سے

سکول قائم کیا، جو پہلے مڈل تک تھا اور پھر 18 جولائی 1885ء کو یہ میٹرک تک ہو گیا۔ رواداری کا عالم دیکھئے کہ 1888ء کے ریکارڈ کے مطابق مدرسہ المسلمین میں 504 طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں 137 ہندو اور 32 سکھ شامل تھے۔ دادا 1908ء میں انتقال کر گئے اور مسجد کے دروازے پر صحن کے ساتھ دفن ہوئے۔ امر تسر کی اسی مسجد سے ختم نبوت کی سب سے بلند آواز سید عطاءاللہ شاہ بخاری ایسی گونجی کہ قادیان کا سحر ٹوٹ کر رہ گیا۔ شاید اسلاف کی یہی نیکیاں ہیں جن کی بدولت اللہ نے مجھے بھی تحفظ ختم نبوت کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ایک رات میں جگمگاتے ہوئے گولڈن ٹیمپل چلا گیا۔ سر پر زرد رومال رکھا، پاؤں بہتے پانی سے دھوئے اور تالاب کے کنارے بیٹھ کر سنہری کلس کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کیا زمانہ ہو گا جب سکھوں کے گوروار جن حضرت میاں میرؒ کو ساتھ لے کر امر تسر چلے آئے اور 13 جنوری 1588ء کو حضرت میاں میر نے اپنے دست مبارک سے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھی۔"

احتیاط نمبر 2:۔ پھر اپنی دانست میں ہندو سکھ تنازعہ پر معلومات فراہم کرتے ہیں کہ:۔

"لنگر خانے سے ایک جانب گردوارہ پر بندھک کے اہم لوگ بیٹھے تھے۔ ان سے میں نے سوال کیا کہ سنت جرنیل سنگھ بھنڈراوالا، جس نے خالصتان کا پرچم بلند کیا تھا، اس نے شہر کے بیچوں بیچ یہاں کیوں پناہ لے رکھی تھی۔ سب نے ایک دم کہا "تم نے کبھی تصور کیا ہے کوئی خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں بیٹھا ہو اور حکومت اس پر حملہ کر دے۔ اسی جرم پر سکھوں نے اندرا گاندھی کو مارا تھا۔ لیکن ہندوؤں نے 1984ء میں جس طرح ہمارے نوجوانوں کے گلے میں ٹائر ڈال کر زندہ جلایا، قتل وغارت کی، گھر بھسم کیے، یہ دکھ 1947ء کے بٹوارے سے زیادہ بڑے اور تازہ ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ہمارا بھروسے کا رشتہ تھا ہی نہیں لیکن ان ہندوؤں کے لیے تو ہم نے جانیں دی ہیں"۔

احتیاط نمبر 3: قادیان میں تشریف لے جا کر مشاہدہ کا ذکر کر کے مزید احتیاط کرتے ہوئے کہ مبادہ ان پر قادیانی ہونے یا کم از کم احمدی دوست ہونے کا الزام نہ دھر دیا جائے اور "اپنے آپ کو خاندانی معاند احمدیت "ثابت کرنے کے لئے لکھتے ہیں:۔

" واپسی پر میں نے ڈرائیور سے سوال کیا یہاں کوئی اور جگہ دیکھنے کو ہے تو اس نے کہا پاکستان کے جتھے تو قادیان جاتے ہیں جو صرف آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ میں اگلی صبح وہاں جا پہنچا۔ سناٹا، خاموشی، ایک بنگالی میزبان نے خوش آمدید کہا۔ اتنے میں ان کا چیف مبلغ حمید کوثر آ گیا۔ مجھے پہچان گیا۔ خاموش سا ہو گیا۔ پھر اس شرط پر قادیان دکھانے پر راضی ہوا کہ کیمرے اور موبائل دفتر میں رکھوا دیئے۔ یہ ہے میرا خاندانی پس منظر اور ختم نبوت کے معاملے میں میری موجودہ پوزیشن اور قادیانیوں کی مجھ سے نفرت ان کے اخباروں ٹی وی چینلوں پر دیکھی جا سکتی

ہے۔"

احتیاط نمبر4:۔ ان ساری پیش بندیوں کے بعد ایک احمدیوں کی بابت ذیل کا ایک معمولی سا سچ بولنے کی جرات کرتے ہیں۔

"یہ سب کچھ اس لئے بیان کیا کہ اب میں جو بیان کرنے جارہا ہوں وہ انتہائی کرب، دکھ اور تکلیف سے بتارہا ہوں۔ ہمارے اس رویئے کی وجہ سے میں بارہا دشمنوں کے سامنے شرمندہ اور لاجواب ہوا ہوں۔ جب سے کرتارپور راہداری کھول کر سکھوں کے مقدس ترین مقام کو راستہ دینے کا اعلان ہوا ہے۔ ہمارے مذہبی، مسلکی، جمہوری اور سیاسی رہنماؤں نے اسے درپردہ قادیانیوں کو سہولت دینے کی سازش قرار دیا ہے۔"

احتیاط نمبر5:۔ اس کے بعد وہ دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقیقت حال بیان کرتے ہیں کہ:۔

"پہلے کرتارپور کا محل وقوع کا جائزہ لیتے ہیں۔ کرتارپور لاہور سے 145 کلومیٹر کے فاصلے پر بھارتی سرحد پر واقع ہے وہ مقام ہے جہاں گورونانک نے زندگی کے آخری 18 سال گزارے تھے۔ نارووال والی یہ سڑک ٹوٹی پھوٹی اور خراب ہے، اس لئے یہ سفر کم از کم ساڑھے تین گھنٹے میں مکمل ہوتا ہے۔ کرتارپور پر بابا گورونانک کی عالم بالا کی طرف رخصتی کے مقام پر ایک گوردوارہ ہے جو بھارتی سرحد سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بیچ میں تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کا دریائے راوی کا پاٹ ہے۔ یوں سمجھیں کہ جیسے بھارتی سرحد کے ساتھ جڑا ہوا ایک گوردوارہ ہے جس کا ایک دروازہ بھارت میں کھلتا ہے۔ میں کرتارپور پراجیکٹ کے افتتاح پر وہاں گیا تھا اور میں نے اس کے ڈیزائن کو دیکھا ہے۔ یہ دراصل سرحد کے ساتھ ساتھ چار مربع کلومیٹر کا ایک احاطہ ہوگا جس کو چاروں طرف سے مضبوط فصیل (Fence) نے گھیرا ہوگا، جس کا ایک دروازہ بھارت کی طرف کھولا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھارتی سکھ دریا کے پار بھارت میں کھڑے ہو کر گوردوارہ کے درشن کیا کرتے اور بھیگتی آنکھوں واپس چلے جاتے۔ اب وہ اس دروازے سے فصیل زدہ گوردوارے یا علاقے میں ایک دن کو داخل ہونگے، درشن کریں گے، ماتھا ٹیکیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ یہ واحد دروازہ ہے جو یک طرفہ ہے اور پورے کا پورا پانچ مربع کلومیٹر علاقہ ایک مقدس گوردوارہ ہے جس میں صرف سکھ داخل ہوسکتے ہیں اور وہاں بھی مذہبی قانون بہت سخت ہیں۔ یہاں دراصل سکھوں کے لئے روزانہ ایک بہشتی دروازہ کھلے گا اور وہ ایک دن کی اجازت سے یہاں آکر واپس چلے جائیں گے۔"

جرات کا مظاہرہ:۔ اس کے بعد کے الفاظ قابل داد جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمعیت علمائے اسلام کے ایک مرکزی لیڈر پر۔ جھوٹ، افتراء اور بہتان بازی کا سو فی صد سچا الزام لگاتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

"اب اس جھوٹ، افتراء اور بہتان کی بات کرتے ہیں کہ یہ سب قادیانیوں کو سہولت دینے کیلئے کیا جارہا ہے۔ اس وقت قادیانی ربوہ سے براستہ امرتسر قادیان جاتے ہیں اور پورا راستہ موٹرویز اور شاندار سڑکوں سے منسلک ہے۔

ربوہ سے لاہور 170 کلومیٹر ہے اور لاہور سے قادیان براستہ امرتسر 102 کلومیٹر۔ یہ سارا سفر سات سے آٹھ گھنٹوں میں بہترین سڑکوں پر مکمل ہوتا ہے۔ اب قادیانیوں اور حکومت کی ملی بھگت سے قادیانی پہلے ربوہ سے 170 کلومیٹر سفر کرکے لاہور آئیں گے۔ پھر یہ بیوقوف 102 کلومیٹر صاف شفاف روڈ چھوڑ کر 145 کلومیٹر ٹوٹی پھوٹی روڈ پر کرتارپور جائیں گے اور پھر وہاں سے 44 کلومیٹر مزید فاصلہ طے کرکے ایک اور بوسیدہ سڑک پر سفر کرکے قادیان پہنچیں گے۔یعنی سفر کی اذیت کے علاوہ وہ چار گھنٹے مزید سفر بھی کریں گے۔"

مزید وضاحت:۔ اس کے بعد اپنے مضمون کا یہ نتیجہ بیان کرتے ہیں:۔

"لیکن کمال ہے اس عصبیت اور منافقت کا جو عمران خان کی دشمنی میں ہمارے مذہبی طبقے کو بھی جھوٹا پروپیگنڈا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ وہ سارے قادیانی جن کے خلاف میں پرچم اٹھا کر کھڑا ہوتا، وہ مجھے جب ایسے جھوٹ پر مبنی بیہودہ اور بے سروپا الزامات والی گفتگو بھیجتے ہیں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔" (مولوی کو پرواہ نہیں)

حیرت دارم: کہ اپنے اس بیان کے بعد مولوی کے مکروہ جھوٹ پر بے بسی کا اظہار کرنے کے بعد بھی وہ اس وہم میں مبتلاء ہیں کہ کوئی مخلص احمدی ان جھوٹوں کے اختراع کردہ دین کی طرف مائل ہو سکتا ہے جس کی عاقبت کی اِنہیں فکر ہے۔

"ایسی گفتگو کرنے والے سوچیں کہ یہ قادیانی تمہارے اس جھوٹے پروپیگنڈے کو اپنی اولاد کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوں گے کہ دیکھو یہ ہیں وہ لوگ جو چھوٹی سی سیاسی کامیابی کے لیے بھی اتنا بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ان پر تم کیسے اعتبار کروگے۔ ایسے میں اگر ایک سلیم الفطرت قادیانی بچہ بھی دین کی طرف مائل ہونے سے رک گیا تو اس کا گناہ ان تمام مذہبی لوگوں پر ہوگا جو جھوٹ کو سیاست کے لیے استعمال کرتے رہے۔"

پاکستان میں منافقت کی عملداری:۔ جناب اوریا مقبول جان کی اوپر دی گئی تحریر کا تجزیّہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ احمدیوں کی بات معمولی سی بات جو سچائی پر مبنی ہو بیان کرنے کے لئے اپنے مزعومہ ایمان کے گرد پہلے فصیل کھڑی کرنی پڑتی ہے اور پھر اصل بات بتا کر بھی جماعت کے متعلق کچھ تعصّب اظہار تقویٰ کے لئے پاکستان میں لازمی ہے۔

تمہارے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی مہک

بیاد حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہرؔ

والد صاحب اپنی آخری ڈوب چکی پونجی کے سلسلہ میں کی گئی نالش کی تاریخ پر مجھے ساتھ لے گئے اور اس وقت ہم شیخ نور محمد صاحب کی عدالت میں کھڑے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ہمارے وکیل اور جج صاحب کیس کے متعلق مختصر گفتگو کے بعد آپس میں گپ شپ کرتے فارسی ادب اور شاعری پر گفتگو شروع کر چکے تھے تب وکیل محترم نے جج صاحب کو فارسی کا ایک قطعہ سنایا۔ پانچ یا چھ الفاظ کے مصرعہ اور اتنے ہی مصرعوں پر مشتمل اس قطعہ کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلے مصرعہ کو پڑھیں اور پھر اوپر سے نیچے ہر مصرع کے پہلے لفظ کو پڑھیں تو بھی وہی مصرعہ سامنے تھا۔ دوسرے مصرعہ کو پڑھیں اور پھر پہلے سے شروع کرتے ہر مصرع کے دوسرے لفظ کو پڑھتے جائیں تو دوسرا مصرعہ ہی سامنے آتا۔ علیٰ ہذا القیاس تمام مصرعے دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے ایک ہی تھے۔

پینسٹھ سال قبل عدالت جانے کے اس پہلے تجربہ کو اس قطعہ نے محترم جج صاحب اور اس سے زیادہ محترم وکیل صاحب کے متاثر کن لہجہ اور شخصیت کا نقش یوں ثبت کیا کہ آج بھی وہ لمحات سامنے آکر وہی خوشبو دے جاتے ہیں۔ انیس سو چھپن میں میٹرک کا امتحان دینے والے اِس طالب علم کی حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر مرحوم سے پہلی ملاقات تھی۔ اور آج اسی نابغۂ روزگار بزرگ و محترم ہستی کے ساتھ، زیر سایہ، یا صحبت میں گزرے خوشگوار لمحوں میں سے محض چند کا ذکر ہو گا۔ ان کی حیات مبارکہ اور عظمت کی داستانیں ادبی خزانوں میں محفوظ ہیں۔ لہذا یہ ذکر صرف میری یادداشتوں پر ہی مشتمل ہے۔

انیس سو تہتر کے لائل پور شہر کو ڈبو دینے والے شدید سیلاب کے پہلے دن سے لے کر اگلے کئی ہفتے مجھے اور میری کار کو میاں غلام احمد (آف انصاف کمپنی، مرحوم) اور ساتھیوں کی رہنمائی میں خدمت خلق کی جو توفیق ملی اس سے قطع نظر سب سے بڑا انعام محترم شیخ صاحب کے زیر سایہ وقت گزارنے کی سعادت تھی۔ سکولوں میں قائم مہاجر کیمپوں میں دُودھ اور ضروری اشیاء پہنچانے کے ساتھ فارغ وقت جماعت کے قائم کردہ مختلف کیمپوں کے معائنہ کے لئے محترم امیر صاحب کو لے جانے کی ذمہ داری میری خوش قسمتی تھی۔ محلہ کریم نگر (شائد مشرف بہ مصطفےٰ آباد نام ہو چکا) میں کئی فٹ پانی گھوم رہا تھا۔ شیخ صاحب کی انتہائی کمزور جسامت اور عمر و صحت کے باوجود ان کے افراد جماعت کے لئے فکر مجھے ان کو وہاں لے جانے کی خواہش پورا کرنا ہوتی تھی۔ پانی شروع ہونے کی جگہ کار پارک کر کے کوئی پون کلو میٹر جگہ جگہ گڑھوں اور کھلے گٹر میں گرنے کے خطرہ کی پرواہ نہ کرتے میرا ہاتھ تھامے آپ چار فٹ تک پانی میں چلتے ڈاکٹر فضل کریم صاحب اور دوسرے احباب کی خیریت پوچھنے، تسلی دینے ان کے گھروں تک پہنچے اور واپس آئے۔ احباب جماعت کی محبت اور ادائیگی فرض کی یہ مثال تمام عمر کے لئے سبق دے گئی۔

ان چند ہفتوں کے ساتھ نے آپ کے مزاج کا یہ پہلو مجھ پہ واضح کر دیا کہ آپ انتہائی ذہین اور معاملہ فہم اور زیرک ہونے کے باعث بات کی تہہ تک فورا پہنچ جاتے ہیں، مختصر مگر صرف موضوع سے متعلق گفتگو ہی سننا پسند فرماتے ہیں اور مختصر مگر جامع جواب سے نوازتے ہیں۔ چنانچہ اسی کو ملحوظ خاطر رکھتے اگلی دو دہائیوں تک مشکل جماعتی معاملات بھی ان کے سامنے پیش کرنے میں آسانی اور توجہ بھی ملی۔

تیس مئی چوہتر کو فیصل آباد میں احباب جماعت کی املاک کی لوٹ مار اور حملوں میں خاکسار کی آٹو پارٹس کی پولیس چوکی ریل بازار کے بالکل سامنے دوکان، رفیق اینڈ برادرز، بھی مکمل جلائی جا چکی تھی۔ میں بہت زیادہ مقروض ہو چکا تھا اور اب آپ کی دعاؤں کی نعمت اور شفقت زیاد مجھے مل چکی تھی۔ ذرا ہوش آیا تو جی چاہا کہ آپ سے دکان پر تشریف لا کر خدا کے حضور اپنے لئے دعا کرنے درخواست کروں۔ آپ قومی اسمبلی کی کاروائی میں مصروف ہو چکے تھے اور وہاں سے واپس تشریف لاتے ہی شدید بیمار پڑ چکے تھے۔ ان کی صحت کے پیش نظر عیادت تک محدود کر دی گئی تھی۔ اور صحت کچھ بہتر ہونے پر بھی شدید خواہش بھی میری جرأت انہیں درخواست کرنے کی نہ پڑ رہی تھی کہ اکتوبر کی ایک سہ پہر محترم حافظ محمد اکرم مرحوم تشریف لائے اور فرمایا کہ حضرت شیخ صاحب پوچھ رہے ہیں کہ کیا تم مجھ سے اپنی دوکان پر لے جا کر دعا نہیں کرواؤ گے۔ اللہ اللہ۔ رب کی شان۔ میں حیران بھی اور رب کے حضور شکر گزاری سے روتے ہچکی بندھ گئی۔ چنانچہ حسب ارشاد صبح کوئی دس بجے انہیں لے کے آیا۔ راستہ میں کوئی بات نہ کی۔ کار سے اترتے ہی سیدھا دکان کے اندر جا کر اپنا وہ مشہور و معروف چوغہ اتار اسے ابھی دھوئیں اور راکھ سے سیاہ فرش (جہاں بیٹھ کر میں جلا ہؤا کار آمد لگتا سامان صاف کرتا) پر بلا تردد بچھایا اور نفلوں کی ادائیگی میں کتنی دیر دعا فرماتے رہے۔ ان کی اس شفقت اور اپنی خواہش خود ان تک پہنچنے اور ان دعاؤں کی قبولیت کا اندازہ ان سب احباب کو ہے جو مجھے جانتے تھے۔ شدید اور طویل ترین سوشل بائیکاٹ کے باوجود میرے رستے کی رکاوٹوں کے دُور ہوتے چلے جانے، نئے رستے پیدا ہوتے چلے جانے اور افضال خداوندی کے حقیقتاً "چھپر پھاڑ" کے نازل ہونے کے نظاروں پر اپنے تو اپنے معاندین بھی آج تک حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔

میاں سعید اختر مرحوم نے ان کی اس بیماری کے دوران ایک دن آ کے بتایا کہ تقریباً نیم بیہوشی سے ہوش میں آتے سب موجود احباب معہ میاں صاحب کو قریب آنے کا کہا اور بڑی تہدّی سے فرمایا: "آپ لوگ فکر نہ کریں میں نے انشاء اللہ بھٹو کا انجام دیکھنا ہے" (مطلب یہی مگر الفاظ میرے ہیں)

انیس سو پچھتر سے انیس سو ستانوے تک خاکسار کو مجلس عاملہ میں خدمت کی سعادت مختلف شعبوں میں ملتی رہی اور انیس سو اکیاسی سے ستانوے کے درمیان بارہ تیرہ مرتبہ مجلس شوری میں نمائندگی کے لئے چنا گیا۔ اس زمانہ میں اکثر مواقع پر اور خصوصا شوریٰ کے دنوں آپ مجھے خدمت کا شرف بخشنے کو ترجیح دیتے اور ڈرائیونگ کرتے بھی ان کی زبان سے واقعات سننے کا موقعہ ملتا۔ یہ شدھی تحریک کے واقعات سے لے کر اخفاء کا عہد نبھاتے ہوتے ہوئے قومی اسمبلی کمیٹی میں حاضری تک بھی ہوتے۔ اس کاروائی اور بحث کے متعلق صرف ایک بار اتنا کہا کہ سپیکر صاحبزادہ فاروق نے کہا کہ سیاسی مصلحتیں اور خود غرضی نہ ہوتیں تو یہ ایسا فیصلہ کجا ایک بھاری اکثریت احمدیت قبول کر چکی ہوتی۔ کبھی شگفتگی کے موڈ میں لطائف بھی ہوتے۔ ایک مرتبہ زبان زد عام مروجہ محاوروں کے متعلق بتایا کہ اکثر

محاورے ادھورے بولے جاتے ہیں۔ پھر مکمل محاورے اور ان کا پس منظر بتاتے رہے۔ کاش کار چلاتے سنے یہ کلمات ریکارڈ ہونے کے وسائل اس وقت مہیا ہوتے۔

ایک مرتبہ ربوہ سے واپسی پر پچھلی نشست پر استراحت فرماتے باہر سڑک پر دھیان ہوتے اچانک پوچھا۔ لئیق صاحب آپ کو یہ فاصلہ میل کی جگہ کلو میٹر بننے کی تبدیلی کیسی لگی۔ عرض کیا کہ فاصلہ تو وہی مگر کچھ لمبا لگنے لگ گیا۔ پہلے ذہن میں ہوتا کہ بس پچیس میل سفر رہ گیا، اب احساس ہوتا ہے کہ اُف ابھی چالیس کلو میٹر اور طے کرنا ہے۔ کچھ دیر باہر دیکھتے رہنے کے بعد اچانک ہنسے اور فرمایا لئیق صاحب آپ نے بالکل ٹھیک تجزیہ کیا اور دیر تک ہنستے رہے۔

مشاورت کے دنوں دارالضیافت کا کمرہ نمبر اڑتالیس (بعد میں تزئین نو ہو چکی) جس کے ساتھ ہی کچن بھی تھا آپ کے لئے مخصوص ہوتا۔ حافظ اکرم صاحب کے علاوہ ہم چند خدام کو بھی فرشی بستر بنا کر قیام کی اجازت اکثر مل جاتی۔ یہ تین روز ہمارے لئے موتی چننے کے دن ہوتے۔ ناشتہ سے قبل ہی جماعت کے نادر ہیرے تشریف لے آتے اور پھر جو علم، وکالت، انتظام، جماعت اور ادب اور شاعری کے موضوعات کے علاوہ کبھی کبھار لطائف وظرائف پر گفتگو ہمارے لئے ازیاد علم و ایمان کا سبب ہوتی۔ ان محفلوں میں میں بزرگوارم شیخ محمد حنیف صاحب کوئٹہ، رانا محمد خان صاحب بہاولنگر محترم مرزا عبدالحق صاحب سرگودھا، جناب چوہدری شبیر احمد صاحب وکیل المال کے علاوہ خواجہ سرفراز صاحب کے ساتھ اور دیگر بہت سی بزرگ ہستیوں کی نیک صحبت سے سرفراز ہونے کی سعادت نصیب ہوتی۔ مشاورت پہ تقریباً ہر سال کسی نہ کسی کمیٹی میں خاکسار کی نمائندگی کے لئے نام پیش کرنے کی آپ کی جانب سے خود ہدایت دی جاتی یا کوئی اور بزرگ پیش کر دیتے اور مجھے بعض اوقات آپ سے ہدایات لینے کا موقعہ مل جاتا۔ مگر سب سے اہم اور بابرکت میرے لئے شیخ صاحب کی ذاتی نامزدگی پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی مشاورت کے دوران وقفہ میں بلائی گئی پاکستان کے نمایاں اور موجود تجار کی میٹنگ میں فیصل آباد کی طرف سے شرکت تھی۔ جس میں حاضری پر جو ہستیاں نظر آئیں ان میں سب سے کم عمر سب سے کم مایہ اور کم تجربہ خاکسار تھا جس کو شیخ صاحب کی نظر کرم نے وہاں پہنچایا۔ اور ایجنڈا پر بحث اور تجاویز اور حضور پر نور کے ارشادات کے بعد میٹنگ کے اختتام پر حضور سے خصوصی پر زور معانقہ کی سعادت کا حصول اور میری تجاویز میں سے اکثر پر صاد ہونا زندگی کا سب سے بڑا انعام نصیب ہوا۔

1980 میں فیصل آباد کے مشہور سماجی اور اصلاح معاشرہ اور فیصل آباد کے قبرستانوں میں تزئین و ترقی کے لئے باقی زندگی وقف کرنے والے علم دین بگا کے اصرار اور اطلاع پر کہ احمدیہ قبرستان کے لئے الاٹ شدہ زمین پر قبضہ کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے، شیخ صاحب نے شیخ سعید اللہ، شیخ محمود احمد ایمن آبادی اور خاکسار کو ملت روڈ پر اکتیس کنال کے اس ٹکڑے کا قبضہ لینے نہری پانی کی منظوری تعمیر و ترتیب قبروں کے قطعات کی تعمیر شجر کاری اور چندہ اکٹھا کرنے کی ذمہ داری سونپی تو قدم قدم پر آپ کی رہنمائی قانونی رائے اور ان کاموں سے متعلقہ احباب کو ساتھ دینے کی ہدایت ہمارے کام کو آسان کرتی گئی۔ اور الحمدللہ کہ احباب جماعت کے تعاون، خدام کے وقار عمل اور آپ کی دعاؤں کے نتیجہ میں ہم متوقع سے بہت ہی کم لاگت پر یہ کام مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس سلسلہ میں کسی بھی درکار مدد کے لئے آپ کی خدمت میں فوری باریابی اور فوری ہدایات نے بہت وقت بچایا۔

ایک دفعہ سفر میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ذکر چھڑنے پہ بتایا کہ شیخ عبداللہ کی وکالت دوستی میں بدل چکی تھی اور جب شیخ عبداللہ (شاید اواخر نومبر 1964) میں پاکستان آئے تو آپ کو تلاش کر کے ملاقات کروانے کی خصوصی فرمائش حکام سے کی۔ ملاقات کے لئے جانے کے لئے تیاری ہو رہی تھی کہ پنڈت نہرو کے انتقال کے باعث شیخ عبداللہ کو واپس جانا پڑ گیا۔ اور نہ مل سکے۔ آپ کی رائے میں شیخ عبداللہ کی فطرت رہنمائی کی محتاج شخصیت والی تھی۔

جھنگ کے شیخ نذر محمد، لاری اڈہ شہر میں ہونے کے زمانے میں سرکلر روڈ پر موجودہ یونائیٹڈ بنک کے سامنے آٹو پارٹس کی دکان کرتے اور ہمارے ابتدائی مشکل دنوں میں اخلاقی مدد ور ہنمائی کرنے والے محسن تھے۔ شیخ نذر محمد صاحب کی دکان مرزا واچ اینڈ الیکٹرک والوں کے پاس کرایہ پر تھی اور کرایہ دار کے خالی نہ کرنے پر تنازعہ تھا۔ انہوں نے مقدمہ کرنا چاہا اور مجھے محترم شیخ صاحب کے پاس وکالت کی ذمہ داری قبول کرنے کی درخواست کرنے کو کہا۔ حضرت شیخ صاحب نے بات غور سننے کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ کو شاید نہیں پتہ کہ مرزا صاحب وہ میرے سامنے والے تیسرے مکان میں رہتے ہیں اور مجھ سے بہت اچھے مراسم اور جماعت کا احترا کرتے ہیں۔ ان کے خلاف کیس تو میں نہیں لوں گا ویسے بھی میں ایسے معاملات میں مقدمہ بازی کو پسند نہیں کرتا۔ میں مرزا صاحب سے بات کرتا ہوں آپ شیخ نذر محمد صاحب کو سمجھائیں کہ دونوں مل کر افہام و تفہیم سے مسئلہ حل کر لیں۔ میں دعا بھی کروں گا۔ میرا پہنچایا ہوا آپ کا مشورہ شیخ نذر محمد نے قبول کیا اور حیران کن طور کچھ دنوں بعد ہی مل بیٹھ کر معاملہ حل ہو جانے کی خوش خبری سنائی اور محترم شیخ صاحب کے احسان اور دعا کے لئے شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ یہ تھا اس عظیم ہستی کا کردار۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک معزز رکن جماعت نے چند افراد کے ساتھ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے ایک انتہائی قیمتی مگر گہرے گڑھے والی سرکاری زمین بہت سستے داموں خریدنے کا پروگرام بنایا اور مجھے اصرار سے بھیجا کہ آپ سے پوچھوں کہ اگر کوئی تنازعہ کھڑا ہو تو آپ ہمارا کیس لیں گے۔ آپ کا مختصر جواب تھا کہ معزز رکن بھلے آدمی ہیں انہیں پیغام دیں آپ نے جائداد خریدنی ہے، مقدمہ بازی اور سر درد نہیں۔ چنانچہ وہ دوست باز رہے اور بعد کے حالات میں وہ اس صائب مشورہ کے بہت شکر گزار رہے۔ یہ تھی آپ کے پیشہ وارانہ اخلاص اور دیانت کی نادر مثال۔

1983 میں فوج کے ایک شعبہ کی سرگودھا روڈ پر جنرل بس سٹینڈ کے سامنے واقعہ بڑے قطعہ زمین پر شعیب بلال مارکیٹ بنا کر پلاٹ بیچنے کی منظوری ہوئی (نواباں والے کے جنرل ضیاء کے دست راست جنرل مجیب کی مہربانی اور ان کے عزیزوں کی سرپرستی) تو اپنے کاروبار کے لئے بہترین جگہ ہونے کی وجہ سے میں نے تین دکانوں اور ان کا عقبی پلاٹ تقریباً دس مرلہ کا سودا کیا۔ ابھی ایک دوکان کی رجسٹری (ڈائریکٹ صدر پاکستان رجسٹری کرواتے) ہوئی تھی کہ اس گروہ کے مخالفین نے مقدمہ کر کے سٹے آرڈر لے لیا اور باقی پلاٹوں کے ایڈوانس دی گئی خطیر رقم (اس پلاٹ سمیت) خطرہ میں پڑ گئی۔ دکان جلائی جانے کے بعد سنبھلتے ہی یہ بہت بڑا نقصان تھا اور پریشانی کے عالم میں حضرت شیخ صاحب خدمت میں حاضر خصوصی دعا کی درخواست کی۔ چند روز بعد آپ کا بلاوا آیا۔ فرمایا لئیق صاحب یہ رجسٹریاں انشاءاللہ بہت جلد دوبارہ ہونا شروع ہوں گی۔ مگر یاد رکھیں (زور دے کر) صرف آپ کی خاطر۔ اور آپ کی وجہ سے بہت سے دوسرے مستفید ہوں گے۔ اور چند ہفتے بعد رجسٹری ہونا بحال ہوا۔ چند دن کے اندر رجسٹریاں کروا کے قبضہ لے لیا۔ بہت سے دوسرے بھی سودے مکمل کر گئے کہ پھر اچانک کوئی سٹے وٹے مقدمہ بازی کا چکر چل گیا اور میرے پاکستان چھوڑنے تک تو باقی خریدار

بغیر قانونی ملکیت قابض تھے بعد کا پتہ نہیں لیکن چند ماہ بعد حضرت شیخ صاحب کے مبارک ہاتھ سنگ بنیاد لگا رہے تھے اور پانچ فروری 1986 کو تیس مئی 1974 کی شام راکھ میں تبدیل شدہ کاروبار فیصل آباد کی آٹو پارٹس کی (رقبہ کے لحاظ سب سے بڑی) دوکان میں منتقل ہو چکا تھا اور یہ محترم بزرگوارم شیخ صاحب کی اس خاکسار کے حق میں کی گئی دعاؤں کی قبولیت کے نشان تھے۔ فالحمد للہ علی ذالک

93-1992 کے سال کے لئے انٹر نیشنل شخصیت کا ایوارڈ آپ کو ملا۔ اس کی یادگار کیلئے محترم بزرگوارم شیخ صاحب کے ہمراہ لیا گیا گروپ فوٹو محترم مرزا ظفر اقبال صاحب نے فیصل آباد سے پچھلے ہفتہ بھیجا تو بہت سی یادیں تازہ ہوئیں۔ ان میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا حضرت منشی ظفر احمد صاحب کے نام محترم شیخ صاحب کی پیدائش پر لکھے مبارک باد کے خط کا عکس بھی ہے، جس کی فوٹو سٹیٹ پاکستان چھوڑے سامان میں رہ کر چوری ہو چکی۔

شائد 1993 کا اوائل تھا شیخ صاحب کی علالت عروج پر تھی اور سوائے دعا اور خدا کے کوئی سہارا اور امید نہ تھی۔ میں عیادت کی اجازت لے گھر پہنچا تو صرف حافظ اکرم صاحب پاس تھے۔ وہ چند منٹ کے لئے کسی کام سے نکلے۔ شیخ صاحب گہری غنودگی یا نیند کے عالم میں تھے۔ اچانک آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھا اور پوچھا کون ہے۔ نام عرض کیا تو بالکل قریب آنے کا ارشاد ہوا۔ میں سرہانے کے قریب زمین پر بیٹھ کان آگے کر چکا تھا کہ نحیف آواز میں فرمایا۔ ”لئیق صاحب ابھی اباجان تشریف لائے تھے۔ فرما گئے ہیں ابھی ٹھہرو میں پھر لینے آؤں گا“۔ اس کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ الفاظ میرے ہیں اصل الفاظ میں نے اسی وقت اندر سے کاغذ پنسل منگا لکھ کے وقت درج کر کے مکرم حافظ صاحب کے حوالے کر کے محفوظ کرنے کی درخواست کی۔ اسی شام طبیعت بہتر ہونا شروع ہوئی اور یہ

مبارک وجود اگلے چند ماہ تک ہم میں موجود رہا۔ مگر یہ فقرہ بالمشافہ ملاقات میں ان کی مبارک زبان سے نکلا میرے ساتھ آخری مکالمہ تھا ۔جس کا رنگ قاری دوست خود پرکھ لیں۔۔

اکثر شب تنہائی میں محترم حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا مبارک وجود میرے سامنے آ کھڑا ہو تا میرے لئے شمع زندگی بن کر ان کی شفقتیں یاد دلاتے ہوئے خدا تعالی کے بے پایاں احسانوں کا شکریہ ادا کرنے کا موقعہ بخش جاتا ہے۔

حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا انٹرنیشنل اعزاز ــــ احباب جماعت احمدیہ فیصل آباد کے ساتھ

تازہ خواہی داشتن

المنار 1951 سے خوشہ چینی

Naeem Ahmad

Intellectual and Social Circle

FAZL-E-UMAR HOSTEL UNION

President	...	Muhammed Aslam Bajwa
Vice-President	...	M. Anwar Ahmad Mubashir.
Secretary	...	Bashir Ahmad Rafiq.
Joint Secretary	...	Abid Ali Abid.
Secretary Common-room		Bashir Ahmad Haji,

During the current session the Union arranged two dinners in honour of the companions of the Promised Messiah. Another dinner was given to Malik Ata-ur-Rahman, Missionary France, and Malik Ihsanul Haq Missionary East Africa. Under the auspices of the Union three declamation contests were held, two in Urdu and one in English. It is heard that the Union has decided to arrange a Mushaira and a picnic to the river Ravi, in the near future.

BAZM-E-URDU

President	...	Mahbub Alam Khalid, M.A.
Vice-President	...	Sayed Mubasharat Ahmad.
Secretary	...	Mohammad Ali.
Asst. Secretary	...	Mohammad Sulaiman.

The Bazm has had a very busy session. The following authorities read their original papers on the subjects noted against their names.

1. Maulana Salah-ud-Din Ahmad, Editor, "Adabi Duniya" ... "The beginning and evolution of 'NAAT' in Urdu poetry."
2. Dr. Ibadat Barelvi, M.A., Ph.D. ... "On Urdu Critics."
3. Dr. Abul Lais Siddiqui, M.A., Ph.D. ... "Theories on the origin of Urdu laugnage".
4. Mahbub Alam Khalid, M A. ... "Evolution of Urdu Poetry."

MAJLIS-E-IRSHAD

Persident	...	Maulvi Arjumand Khan, H.A.
Vice-Presidents	...	M. A. Khalid, M.A., Maulvi Ghulam Ahmad, H.A.
Secretary	...	M. Anwar Ahmad Mubashir.

The Majlis has been formed to introduce and interpret modern world problems in the light of Islam and to inculcate among the rising generation

the ideals of Islam. In its efforts to make Islam a practical study, controversial issues are scrupulously left out and empbasis is laid on the beauties of Islam.

The following spoke on the subjects noted against their names :—

1. Malik Ata-ur-Rahman ... "The future of Islam in Missionary France Europe."
2. Maulana Jalal-ud-din Shams ... "Necessity of acquiring the Late Imam London Mosque. knowledge of Quran".

ECONOMICS SOCIETY

PATRON	...	F. R. Faizi, M.A.
President	...	Ch. Aziz Ahmad.
Vice-President	...	Bashir Ahmad Rafiq.
Secretary	...	Ijaz Ahmad.
Joint-Secrtary	...	Mansoor Mobarak.

The Society has been holding regular meetings in which students take keen and active interest. The following authorities have delivered their lectures on the subjects noted against their names.

1. Mr. Munir Hussain, M.A., Lecturer, ... Industrial development of Punjab University. Pakistan.
2. Mr. Zia Samad, M.A., Lecturer, Dyal ... Agrarian Reforms. Singh College.
3. Azam Aurakzai, M A., Lecturer, Punjab ... Future of Agriculture. University.
4. Dr. S. M. Akhtar, M.A., Ph.D., Head ... Conditions of Economic of the Economics Department, Progress of Pakistan. Punjab University.

ARABIC SOCIETY

President	...	S. Basharatur Rahman, M.A.
Vice-President	...	Ch. Mushtaq Ahmad.
Secretary	...	Bashir Ahmad.
Joint Secretary	...	Abdul Majid Shahid.

The Society's aim is to promote interest in Arabic among the young generation. Arabic is our religious language and, moreover, Quranic knowledge cannot be gained without it.

Recently under the auspices of the society a recitation competition of Quranic verses was held, in which a considerable number of students participated. On another occasion Qazi Zaheer-ud-Din, Head of the Department of Arabic, Islamia College, delivered a lecture on "The Future of Arabic in Pakistan".

المنار ستمبر اکتوبر دسمبر 1951 سے

(فیض الرحمان فیضی۔ ایم ۔ اے)

املا ۔ تلفظ ۔ محاورے ۔ زبان اور روزمرہ کی اغلاط اور اُن کی تصحیح ہم انشاءاللہ تعالیٰ "المنار" کے ہر شمارہ میں پیش کریں گے۔ طلباء اس جانب توجہ فرمائیں

غَلَط	صَحیح	غَلَط	صَحیح
۱۔ بُرقعہ	بُرقَع	۱۱۔ وَطن	وطَن
۲۔ مِصرعہ	مِصرَع	۱۲۔ حَدّو جِہد	جِدّ و جُہد
۳ رُوحِ رَواں	رُوح و رَواں	۱۳۔ آمَروز	اِمرُوز
۴۔ سَلامٌ علیکم	اَلسَّلامُ عَلَیکُم	۱۴۔ ظفر حبیب کالج میں ہوا کرتا تھا	ظفر حبیب کالج میں تھا
۵۔ مَیّت	مَیِّت	۱۵ تم نے میرے ساتھ پڑھنا تھا	تمہیں میرے ساتھ پڑھنا تھا۔
۶ بمعہ	مَع	۱۶۔ مُسوِّدہ	مَسَوَّدَہ
۷ وَقت	وَقت	۱۷۔ مَحبّت	مُحبّت
۸۔ اُفق یا اُفَق	اُفُق	۱۸۔ لَاحق	لاحِق
۹۔ شَمَع یا شَمع	شَمع	۱۹۔ بُرا منانا	بُرا ماننا
۱۰۔ صُبَح یا صُبُح	صُبح	۲۰۔ خَتَم	خَتْم

راحت ملک

غزل!

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی
شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
تم خدارا یہاں چلے آؤ
زندگی مختصر نہیں ہوتی
یہ سویرا عجب سویرا ہے
تیرگی منتشر نہیں ہوتی
آپ کی یاد ایک لمحہ بھی
آپ سے بے خبر نہیں ہوتی
ڈوب ہی جاؤ ڈوبتی نبضو!
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
بے خودی کی عجیب حالت ہے
آپ سے پیشتر نہیں ہوتی
آپ شکوا فضول کرتے ہیں
ہم کو اپنی خبر نہیں ہوتی
جانے کیا بات ہے کہ اَب راحت
اُن کی آمد اِدھر نہیں ہوتی!

WE are saddened by the tragedy happened in Murree Pakistan. A poem about the same Murree was published in English in January 1951 in the journal Al-Manar of Taleem-ul-Islam College. Whereabouts of the creator (a student of TIC) of this poem is not known today. This commemorative poem is at the service of friends.

Murree Hills

(EJAZ NABI)

Yonder lofty mountain peaks,
Stand proud of their splendour
And every snow-clad summit speaks,
Aloud of its snowy grandeur.

That sweat and heavenly beauty,
Holds me in its magic spell,
But sweeter are the feelings that rise,
Within my heart which I can`t tell.

This unique and divine charm,
Reigns supreme within my heart,
While my soul, in reverence, chants,
Praises to the Creator`s art.

There Grace is rugged and antique,
Unchanged, immutable since its birth,
Bearing mute testimony to changes,
That have rocked the bosom of earth.

Methinks the Angels there alight,
And take repose in their leisure,
Where they watch the deeds of man,
In silent wonder, pain and pleasure.

Greetings

From Almanar Jun 1950

Sincerest 'Welcome', we extend
To you, O Fresher, First year Friend!
To College premises you impart
'Fresh glow'—so joyful and so smart.

If seniors sometimes harass you
As out of love brothers generally do,
You must not boisterously shriek and cry,
Like a Frightened bird you need not fly

They mean to equip you to fight out, friend!
The struggle of life that doth not end,
They want to make you strong and brave,
So fret not, foam not 'gainst any wave.

Yes, here before your eyes you view,
"Fresh green woods and pastures new".
They'll shower over you very lavishly,
Delight, experience, wit and glee.

So choose most wisely books and friends,
Goals and purposes, aims and ends,
Bearing in view the saying—so old,
"All that glitters is not gold".

SUFI ABDUL AZIZ M.A.

مکرم صوفی عبدالعزیز صاحب ایم اے کی یہ بہتر سالہ پرانی یادگار نظم بہت سے دلوں میں تعلیم الاسلام کالج کی کئی پرانی یادوں کو تازہ کرنے والی ہے۔

PIN-PRICKS

We had "Discuss and Throw" instead of the usual "Discuss Throw" in the Annual Athletic Tournament this year. Besides being more lively, it has the physical advantage of developing our vocal cords and laryngeal muscles.

●

The much talked of Old Boys Association of the College is reported to have extended its scope by discovering new connotation in its name. Originally an old boy meant an ex-student of the College. Now it means a student who is old, or for that matter, old enough to pay the monthly and membership fees of the Association.

●

It is reported that debates have been completely abolished from the College. This decision is being *debated* very fiercely.

●

The new curtains of the Staff Tennis Club appear almost ironical in there silence. We hope they are not "iron curtains". The moment they are raised all traffic stops in that area and total, deathlike silence prevails all around. What happens behind these curtains is a closely guarded secret for the prying, inquisitive and eager glances of the non-members always stop short of the closed frontiers of the Club. No admittance without passport is the rule.

●

Subsidiary to the grow more trees drive another compaign for growing bushes is being proposed, obviously under the idea that beating about a selfgrown bush is a very much more economic pastime and useless "employment" besides being a sure sign of mental "vacancy".

M. A. Ch.

ٹکوسا جرمنی کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرہ 25 دسمبر 2021 کی

چند تصویری جھلکیاں

ARKhan Qinde...
iPad von Rahee...
Asif Parvez
Hamid Ahmad...
Mansoor
Kahlon
Abdul Rehman ...
Munir's iPhone
Sir Iftikhar Aya...
IJAZ Ahmad.
Ataul Qadir Ta...
Syed Hassan K...
zeeshan 's iPho...
Basit Mirza
Muhammad Saf...
Waseem choud...
Abdul Abid
Rafay Abdul
Ahsan Khan
Sharif Ahmad
Samreen Muzaf...
iPhone von No
Naseer's iPhon...
Mirza Hafwez
zoom

EIN SPATZ MEIN SOHN

(Shahid Nawaz Student Jamia Ahmadiyya Deutschland)

An einem schönen Tag saß ein Vater mit seinem Sohn im Garten des Hauses. Der Vater hatte bereits ein hohes Alter erreicht. Der Sohn jedoch war noch jung und hübsch. Er las ein Buch, welches er in der Hand hielt. Der alte Vater sah etwas in der Luft. Er konnte zwar nicht richtig sehen, dennoch betrachtete er den Himmel. Plötzlich sah er etwas zwischen den Blumen. Ein Spatz näherte sich. Schleunigst fragte er seinen Jungen:

„Schau! Schau mal, was ist das?
Mein Sohn, was ist das da? „

Der beschäftigte Sohn antwortete ihm:

„Mein Vater, es ist ein Spatz.
Es ist nur ein Spatz, ein Spatz“.

Der Spatz flog weg, kam jedoch wieder zu dem Zaun des Gartens, zu dem Garten wo es auch zuvorkam. Der Vater fragte erneut:

„Schau! Schau mal, was ist das?
Mein Sohn, was ist das da?“

Der Sohn fühlte sich genervt antwortete seinem Vater:

„Mein Vater! Es ist ein Spatz!
Dies habe ich bereits erwähnt!“

Nach einer Weile kam an der Stelle, wo sie saßen, erneut ein Spatz aus dem Grass hervor. Es fing an zu zwitschern. Der Vater sah es sich wieder an und er trug seine Brille auf seiner Nase. Der alte Mann berührte die Hand seines Sohns und fragte erneut:

„Schau! Schau mal, was ist das?
Mein Sohn was ist das da?“

Diesmal reagierte der Sohn sehr gereizt. Schreiend und ermahnend sprach er:

„Warum strapazierst du meine Geduld?
Warum ärgerst du mich?
Ich habe es schon mehrmals gesagt!
Es ist ein Spatz!
Mein Vater, es ist ein Spatz!“

Der Spatz kam näher, denn da lag etwas zum Fressen neben den Füßen des Vaters.Der Vater sprach wieder zum Sohn:

„Schau! Schau mal, was ist das da?
Mein Sohn, was ist das da?
Was ist das neben meinen Füßen?“

Diesmal konnte der Sohn nicht mehr ertragen, dem Vater ständig dasselbe wiederholen zu müssen. Er geriet außer sich und empfand seinen Zorn als gerechtfertigt, der sich dann zu einer Arroganz umwandelte. Er schrie und

brüllte laut:

„Herr Gott! wie soll ich es dir heute noch erklären?
Wie bringe ich dich zum Verstehen?
Es ist ein Spatz, ein Spatz ist zu sehen,
Spatz, wie S Spatz, S Spatz.
Es ist nichts anderes als ein Spatz.
Und ich sage dies zum letzten Mal.
Es ist eine Qual, die ich ertrage.
Es ist eine Hölle, was ich erlebe.
Ich begreife nicht, warum versteht es dieser Greis nicht.
Der Greis ist eine Zumutung."

Als der Vater dieses Geschrei seines Sohnes hörte ging er schleppend zum Haus. Nach einer Weile kehrte er zurück und trug ein Büchlein in seiner Hand. Dies überreichte er seinem Sohn.

„Mein Sohn bitte lies, was ich in diesem Buch niedergeschrieben habe. Aber lies so laut, dass ich alter Greis es auch hören kann."

Der Junge sah nun ein Schriftstück seines Vaters, welches 30 Jahre alt war. Es war ein Tagebuch.

Betitelt mit dem Wort „Spatz".

Darin stand

„Mein Herzstück, mein Sohn ist heute drei Jahre alt. Er kann jetzt gut sprechen. Wenn er redet, klingt das wie Melodie, die durch meine Ohren fließt. Er redet und redet immer weiter, so lieb ist mir sein Sprechen. Heute war mein Sohn mit mir in unserem Garten. Und er saß neben mir. Da kam ein Vögelchen, ein Spatz und er fragte mich:

„Schau mal Papi,
was ist das für ein Ding?
Vati, sieh mal, was ist das?"

Ich küsste seine Stirn und sagte zu meinem Sohn:

„Das ist ein Spatz mein Sohn."

Diese Frage war ziemlich einfach.

Aber er fragte mich dies dreißigfach. Jedes Mal küsste ich ihn, nahm ihn in meine Arme und sagte ihm jedes Mal:

„Es ist ein Spatz mein Sohn."
Lächelnd sang ich: "choon, choon, choon."
Mein Sohn machte nach: „choon, choon, choon."

Bei jeder seiner widerholten Frage machte er mich aufs Neue glücklich. Aber er fragte nur dreißig Mal und war danach abgelenkt.

Hätte er mich auch hundertmal gefragt, so hätte ich ihm auch dann eine liebevolle Antwort geschenkt. Ich wäre nie ermüdet, ihm das zu das erzählen"

Während der Sohn diese Seiten las, überkam ihm Scham und Reue, so dass sogar seine Lippen erstarrten. Aus seinen Augen flossen Tropfen.

Dem Vater fiel es schwer diese zu sehen. So nahm er seinen Sohn in seine Arme und küsste seine Stirn.